دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

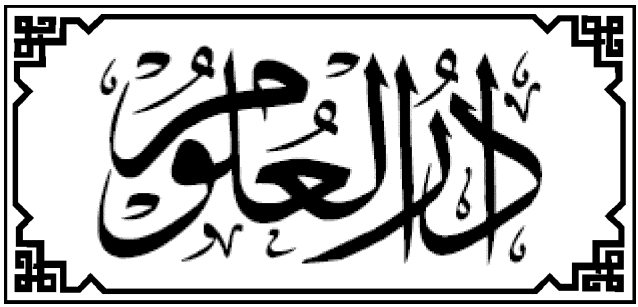

جلد: ۹۵	جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ مطابق اپریل ۲۰۱۱ء	شمارہ: ۴

نگراں	مدیر
مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند- ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ-/۱۵ روپئے، سالانہ-/۱۵۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ-/۱۱۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ-/۵۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم-/۵۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	رحمۃ للعالمین ﷺ اور اہل مکہ	مولانا توحید عالم بجنوری	۷
۳	قرآن کریم کی روشنی میں افراد سازی	اختر امام عادل قاسمی	۱۸
۴	ذوالقرنین-ایک تحقیقی جھلک	ڈاکٹر نوشاد عالم	۳۱
۵	عربی تفسیروں کے اردو ترجمے-تعارف وتجزیہ	مولانا اشتیاق احمد	۳۵
۶	جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار	محمد احمد ابن مولانا محمد شفیع قاسمی	۴۷

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

اسلام کی تاریخ میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طبقہ وہ منتخب اور برگزیدہ طبقہ ہے، جسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان قابلِ اعتماد واسطہ کی منفردانہ حیثیت حاصل ہے، پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے یہ ساتھی ہی، آپؐ کے پیغام ہدایت ورحمت اور آپ کی سعادت بداماں تعلیمات کو پورے عالم میں پہنچانے والے ہیں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں کے اس داعیانہ کردار کا اعلان خود ربِ علیم وخبیر نے اپنے رسول کے ذریعہ ان الفاظ میں فرمایا ہے:

"قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِي اَدْعُوْ إلى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنُ اتَّبَعَنِى (الآية)

آپ اعلان کردیں کہ یہ میرا راستہ ہے، بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور میرے ساتھی۔

مطلب یہ ہے کہ کسی اندھی تقلید کی بنیاد پر نہیں؛ بلکہ حجت وبرہان اور بصیرت ووجدان کی روشنی میں، میں اور میرے اصحاب دینِ توحید کی دعوت دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو پیغمبرانہ نور بصیرت عطا فرمایا تھا، ہر صحابیِ رسول کا دل ودماغ آپ کی صحبت ومعیت کی برکت سے اس نور سے روشن ہوگیا تھا اور دعوت إلى الله على وجه البصيرة میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست وبازو اور رفیقِ کار بن گئے تھے۔ حدیث پاک "ما أنا عليه وأصحابي" میں پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے اصحاب کی اسی رفعت شان اور بلندترین داعیانہ کردار کو نمایاں فرمایا ہے؛ اس لیے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت درحقیقت امام المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا جزء ہے، عام شخصیات ورجال کی طرح انھیں صرف کتبِ

تاریخ کی روشنی میں نہیں؛ بل کہ قرآن وحدیث اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینہ میں دیکھا جائے گا۔

معروف شارحِ حدیث وسیرت قاضی عیاض مالکیؒ لکھتے ہیں:

ومن توقيره صلى الله عليه وسلم توقيرُ اصحابه، وبرّهم ومعرفة حقهم، والاقتداء بهم وحسن الثناء عليهم والاستغفار لهم، والإمساك عمّا شجر بينهم، ومعاداة من عاداهم، والإضراب عن أخبار المؤرخين وجهلةِ الرواة (الأساليب البديعة ص۸)

صحابۂ کرامؓ کی توقیر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر کا ایک حصہ ہے، ان سے بھلائی کا معاملہ کرنا، ان کے حق کو پہچاننا، ان کی پیروی کرنا، ان کی مدح وستائش کرنا، ان کے حق میں دعائے استغفار کرنا، ان کی باہمی آویزش کے ذکر سے (زبان وقلم کو) روکنا، ان سے عناد رکھنے والوں سے عناد اور دشمنی رکھنا، مؤرخین اور ناواقف راویوں کی (ان کی خلافِ شان) روایتوں سے اعراض کرنا۔

شیخ مشائخنا، شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ سابق صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں جو آیات وارد ہیں، وہ قطعی ہیں، جو احادیث صحیحہ ان کے متعلق وارد ہیں، وہ اگرچہ ظنّی ہیں؛ مگر ان کی اسانید اس قدر قوی ہیں کہ تواریخ کی روایات ان کے سامنے ہیچ ہیں؛ اس لیے اگر کسی تاریخی روایت میں اور آیات واحادیث صحیحہ میں تعارض واقع ہوگا تو تواریخ کو غلط کہنا ضروری ہوگا۔'' (مکتوبات شیخ الاسلام، ج۱،ص۲۴۲ مکتوب ۸۸)

آیتِ پاک:

اَلسَّابِقُونَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عنه وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ تَحْتَهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فيها اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْم (سورة توبه آیت: ۱۰۰)

اور جو لوگ قدیم ہیں، سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے، جو لوگ ان کے پیرو ہیں، نیکی کے ساتھ، اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اللہ سے، تیار

کرر کھے ہیں واسطے ان کے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں، رہا کریں اس میں ہمیشہ، یہی ہے بڑی کامیابی!

مُسندِ ہند سراج الامت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''جو شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہے، جب اس کے علم میں یہ بات آ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے بعض بندوں کو دوامی طور پر جنتی فرمایا ہے، تو اب ان کے حق میں جتنے بھی اعتراضات ہیں وہ سب ساقط ہوگئے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں بندہ سے فلاں وقت میں نیکی اور فلاں وقت میں بدی صادر ہوگی، اس کے باوجود جب وہ اطلاع دے رہے ہیں کہ میں نے اسے جنتی بنادیا، تو اسی کے ضمن میں اس بات کا اشارہ ہوگیا کہ ان کی تمام لغزشیں معاف کردی گئی ہیں، لہٰذا اب ان مغفور بندوں کے حق میں کسی کا لعن طعن اور برا بھلا کہنا، حق تعالیٰ پر اعتراض کے مرادف ہوگا؛ اس لیے کہ ان پر اعتراض اور زبانِ طعن دراز کرنے والا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ یہ بندہ تو برا ہے، پھر اللہ نے اسے جنتی کیسے بنادیا اور ظاہر ہے کہ اللہ رب العزت پر اعتراض کفر ہے۔ الخ

علامہ ابن تیمیہؒ نے ''الصارم المسلول'' میں قاضی ابویعلی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

''رضٰی'' اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدیم ہے، وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انھیں کے لیے فرماتا ہے، جن کے متعلق وہ جانتا ہے کہ ان کی وفات اسباب رضا پر ہوگی۔

علامۂ موصوف ہی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

ما ذكر عن الصحابة من السيئات كثير منه كذب، وكثير منه كانوا مجتهدين فيه لكن لايعرف كثير من الناس وجه اجتهادهم، وما قدّر أنه كان فيه ذنب من الذنوب لهم فهو مغفورلهم إما بتوبة، وإما بحسنات ماحية وإما بمصائب مكفرة، وإما بغير ذلك، فإنه قد قام الدليل الذي يجب القول بموجبه أنهم من أهل الجنة، فامتنع أن يفعلوا ما يوجب النار لا محالة، واذا لم يمت أحدهم على موجب النار لم يقدح ذلك فى استحقاقهم الجنة. (المنتقٰی،ص:۲۱۹-۲۲۰)

صحابہ کی جانب جو سیئات منسوب کی گئی ہیں ان میں بیشتر جھوٹی ہیں اور ان میں بہت سی وہ ہیں، جن کو انھوں نے اپنے اجتہاد سے (حکمِ شرعی سمجھ کر) کیا ہے؛ مگر لوگوں کو ان کے اجتہاد کی

دلیل معلوم نہیں ہوسکی اور جنھیں گناہ ہی مان لیا جائے، تو وہ گناہ معاف ہوگیا ہے، یہ عفو ومغفرت یا تو توبہ کی بناء پر ہے یا ان کی نیکیوں کی کثرت نے ان گناہوں کو مٹادیا، یا دنیاوی مصیبتیں کفارہ بن گئیں اور دیگر اسباب مغفرت بھی ہوسکتے ہیں؛ کیوں کہ دلیل (قرآن وحدیث) سے ان کا جنتی ہونا ثابت ہوچکا ہے؛ اس لیے ناممکن ہے کہ کوئی ایسا عمل ان کے نامۂ اعمال میں باقی رہے جو جہنم کا سبب بنے، تو جب صحابہؓ میں سے کوئی ایسی حالت میں وفات نہیں پائے گا، جو دخولِ دوزخ کا سبب بنے، تو اب کوئی چیز ان کے مستحقِ جنت ہونے میں مانع نہیں ہوگی!

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حاصل اس مقامِ بلند کی بنا پر اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ تمام صحابہؓ عادل، قابلِ اعتماد اور جنتی ہیں اور ان کی شان میں زبانِ طعن دراز کرنا فسق وفجور ہے۔ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا.

وصلى الله على سيدنا ومولانا محمد على آله وأصحابه أجمعين.

❁ ❁ ❁

رحمۃ للعالمین ﷺ اور اہل مکہ

از: مولانا توحید عالم بجنوری
استاذ عربی، دارالعلوم دیوبند

ظہورِ قدسی

آفتابِ ہدایت، امام الانبیاء، حبیب کبریا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جب دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو صورتِ حال یہ تھی کہ ولادت مبارکہ سے پہلے ہی والد بزرگوار حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کا انتقال ہو چکا تھا؛ لیکن دادا محترم خواجہ عبدالمطلب خود بھی یتیمی کا زمانہ دیکھ چکے تھے؛ اس لیے اپنے چوبیس سالہ نوجوان پیارے فرزند عبداللہ کی اس یادگار کو بہت پیار اور محبت دیتے تھے؛ چنانچہ پیدائش کی خبر پاتے ہی نومولود کو بی بی آمنہ سے لے کر خانہ کعبہ میں لے گئے اور دعاء وغیرہ سے فراغت کے بعد لائے اور محمد نام رکھا؛ جب کہ والدہ ماجدہ نے الہامی نام احمد رکھا، دونوں ہی نام عرب معاشرہ کے لیے نئے تھے۔ قریش نے عبدالمطلب سے کہا کہ یہ نام تو بالکل نیا ہے، تو جواب دیا کہ مسمّٰی ہی نرالہ ہے سردار مکہ نے ساتویں دن ولیمہ کیا اور تمام قریش کی دعوت کی، آپ کے چچا ابولہب نے جب بھتیجے کی ولادت باسعادت کی خبر سنی تو اپنی کنیز ثویبہ کو نومولود کی خدمت کے لیے آزاد کر دیا، یہ اُن خوش نصیب خواتین میں سے ہیں جن کو رحمۃ للعالمین کو دودھ پلانے کی سعادت میسر ہوئی؛ کیوں کہ ابتداء میں آپ ﷺ کو حضرت آمنہ نے اور ان کے بعد حضرت ثویبہ نے دودھ پلایا، انھوں نے ہی حضرت حمزہؓ کو بھی دودھ پلایا تھا؛ اسی لیے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے چچا بھی تھے اور دودھ شریک بھائی بھی، پھر حضرت ﷺ کو دودھ پلانے کی سعادت عظمیٰ حضرت حلیمہ سعدیہ کے حصہ میں آئی، جو ظہور اسلام کے بعد مسلمان ہوئیں رضی اللہ عنہا وعنہم۔

والدہ ماجدہ اور دادا محترم سے مفارقت

قضاوقدر کا کرشمہ ہی تھا کہ چھ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے، اسی عہد طفولت میں والدہ ماجدہ

بھی خدا کو پیاری ہوگئیں؛ لیکن دادا محترم کا مشفقانہ سایہ ابھی باقی تھا تربیت و پرورش کی ذمہ داری بھی دادا محترم فرمارہے تھے، ابھی ماں کا غم غلط بھی نہ ہوا تھا کہ دادا بھی داغ مفارقت دے کر خدا کو پیارے ہوگئے، اب تربیت و پرورش کا بار چچا محترم ابوطالب نے بڑی خوش اسلوبی اور انتہائی شفقت ومحبت کے ساتھ اٹھایا اور ماں باپ، یا دادا کے غم کو غلط فرمانے میں مکمل تعاون دیا؛ لیکن خداوند قدوس اپنے محبوب کو اس طریقے کے واقعات وحوادثات سے اشارہ دینا چاہتا تھا کہ اصل مربی اور رب وہ ذات ہے جو حَیٌّ لَایَمُوْتُ ہے اور آپ ﷺ کو ظاہری مربیوں کی تربیت اور پرورش سے بے نیاز فرمادیا یا پھر ایسی پرورش ہوئی کہ ساری دنیا بھی مل کر نہ کرسکے، لہٰذا عجیب شان والا بچہ ہے اور نرالے اوصاف سے متصف ہے کہ نہ کھیل ہے نہ کود، نہ بچوں سی ضد ہے اور نہ بیہودہ حرکتیں، نہ لڑائی ہے نہ جھگڑا؛ بل کہ ایسے اوصاف ہیں جو بڑوں بڑوں میں ناپید ہیں، ہمیشہ سچ بولنا اور سچ کو فطرتِ ثانیہ بنالینا کہ عرب صادق کا لقب دینے پر مجبور ہوئے؛ حالانکہ اس دورِ جاہلیت میں خلافِ واقعہ اور جھوٹ کو ایک کمال تصور کیا جاتا تھا، اسی طرح امانت ودیانت آپ ﷺ میں اس قدر پائی جاتی تھی کہ عبداللہ کے اس دُرِّ یتیم اور آمنہ کے لعل کو قریش امین سے یاد کرتے تھے، جب کہ اس شر ور وفتن کے دور میں بچوں کو چھوڑیئے بڑوں میں بھی شاذ ونادر ہی امانت ودیانت پائی جاتی تھی۔

نکاح

بچپن سے جوانی تک آپ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ اور عباداتِ مبارکہ سے قریب قریب تمام قریش متاثر تھے، اسی لیے تمام مکہ میں آپ ﷺ کو پیار، محبت، شفقت اور الفت خوب خوب ملی اور ہر طرف آپ ﷺ کے بلند کردار، اچھے اخلاق اور پاکیزہ عادات وصفات کا چرچہ تھا، شدہ شدہ یہ خبریں ایک پاکباز اور خوش بخت خاتون حضرت خدیجہ بنتِ خویلد کو بھی پہنچیں اور یہ خاتون پہلے سے دوشوہروں کے ساتھ رہ چکی تھیں، صاحب اولاد تھیں، ساتھ ہی صاحبِ ثروت ودولت بھی، لہٰذا اس خاتون نے آپؐ کو اپنا مال لے کر ملک شام تجارت کے لیے بھیجا اور اپنے ایک غلام میسرہ کو ساتھ میں لگایا پورے سفر میں اس غلام نے آپؐ کے اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار وعادات کا خوب خوب مشاہدہ کیا اور تجارت میں بھی خوب نفع حاصل ہوا، واپسی پر غلام میسرہ نے خدیجۃ الکبریٰ سے حالاتِ سفر بیان کیے، تو آپؐ کے اخلاق، کردار، عادات اور اوصاف بیان کرتے کرتے تھکتے نہ تھے جس کا خدیجہؓ

کے دل پر عجیب اثر ہوا، لہٰذا انھوں نے اپنی خواتین سے مشورہ کرکے آپؐ کو پیغامِ نکاح دیا، یہ خاتون اگرچہ بیوہ تھیں؛ لیکن بڑے بڑے سرداروں کے پیغامات ٹھکرا چکی تھیں اور آپؐ کو سنتِ انبیاء پر عمل کرنا اور امت کو سبق دینا تھا، لہٰذا چچا بزرگوار حضرت ابوطالب سے مشورہ کیا اور اشارہ پاکر پیغام قبول فرمایا۔ واضح رہے کہ عین عنفوانِ شباب کا عہد تھا، اگر نفسانی خواہشات کی تکمیل مقصود ہوتی تو اپنے سے پندرہ سال بڑی اور صاحب اولاد بیوہ خاتون سے عقد نہ فرماکر کسی دوشیزہ اور نوجوان خوبصورت وخوبرو لڑکی سے عقدِ نکاح ہوتا؛ البتہ حضرت خدیجہ بنت خویلد بھی معزز اور شریف خاندان وقبیلہ سے تھیں، جیسا کہ آپؐ نجیب الطرفین تھے، یعنی آپ ﷺ کا ددھیال اور ننھیال دونوں ہی عرب کے بہترین قبیلے، بہترین قوم اور بہترین شاخ تھے، یہی وجہ بھی تھی کہ آپؐ کا تمام قریش ادب واحترام کرتے تھے، پس آپؐ کے عقدمسنون میں تمام رؤساءِ قریش شریک ہوئے اور خطبہ ابوطالب نے پڑھا اور یہ نکاح نہایت بابرکت ثابت ہوا۔

قیامِ امن انجمن کا قیام

اس نکاح اور عقد کے بعد آنحضرت ﷺ کا سارا وقت عبادتِ خدا اور بنی آدم کی فلاح وبہبود اور خیراندیشی میں مصروف رہتا تھا، انہی دنوں آپؐ نے اکثر قبائل کے سرداروں اور باشعور لوگوں کو ملک کی بے امنی، راستوں کا خطرناک ہونا، مسافروں کا لٹنا اور غریبوں، کمزوروں اور زیردستوں پر زبردستوں کا ظلم بیان کرکے ان سب باتوں کی اصلاح پر توجہ دلائی، آخر ایک انجمن اور کمیٹی قائم ہوئی جس میں بنوہاشم، بنومطلب، بنواسد، بنوزہرہ اور بنوتمیم شامل ہوئے اور اس انجمن وکمیٹی کے اہم مقاصد یہ تھے: (۱) ملک سے بے امنی دور کرنا (۲) مسافروں کی حفاظت کرنا (۳) غریبوں کی امداد کرنا اور (۴) زبردستوں کو زیردستوں پر ظلم کرنے سے روکنا (رحمۃ للعالمین، ج۱، ص۴۳)

واقعۂ تحکیم

اسی طرح جب تعمیر کعبہ کے موقع پر حجرِ اسود کو نصب کرنے میں تمام قبائل قریش باہم شدید اختلاف کا شکار ہوئے یعنی ہر قبیلہ اور خاندان حجرِ اسود کو نصب کرنے کی دولت اور سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا یہ اختلاف جب حد سے تجاوز کرگیا تو ابوامیہ بن مغیرہ نے رائے دی کہ کسی کو حَکَم اور فیصل بنالیا جائے، پھر اس کے فیصلہ اور حکم پر عمل کیا جائے، اپنے سب سے معمَّر شخص کی رائے کو

تمام قبائل نے پسند کیا اور یہ طے ہوا کہ کل صبح خانۂ کعبہ میں جو سب سے پہلے آئے وہی حَکم ہوگا، حسن اتفاق کہ سب سے پہلے حرم شریف میں آنے والے شخص حضرت محمد ﷺ تھے اور جب قریش نے دیکھا کہ محمدؐ ہیں تو خوشی سے نعرہ لگایا ھٰذَا لَأمینٌ رضیناہ (امین آگئے ہم سب راضی اور خوش ہیں) چنانچہ آپؐ نے ایسا حکیمانہ فیصلہ فرمایا کہ کسی کی نہ دل شکنی ہوئی اور نہ کوئی اس دولت وسعادت سے محروم رہا (ہادیٔ عالم ص ۵۳)

قرب زمانۂ بعثت

جب بعثت کا زمانہ قریب ہوا تو آپؐ کو آبادی سے وحشت ہونے لگی اور آپؐ تنہائی تلاش کرنے لگے؛ چنانچہ پہاڑوں میں جاکر غارِ حرا میں کئی کئی دن قیام فرماتے، ستو اور پانی اپنے ہمراہ لے جاتے یا کبھی کبھی حضرت خدیجہؓ ہی کھانا وغیرہ پہنچادیتی تھیں، وہاں عبادتِ خداوندی میں مصروف رہتے، اس عبادت میں تحمید وتقدیسِ الٰہی کے ساتھ قدرتِ الٰہیہ پر تدبر وتفکر بھی شامل تھا، اسی وقت آپؐ کو رات میں خواب دکھنے شروع ہوئے اور یہ خواب نہایت سچے ہوتے تھے، یعنی جو کچھ رات میں خواب میں نظر آتا، دن میں ویسا ہی ظہور میں آتا۔ (رحمۃ للعالمین بحوالہ مشکوٰۃ شریف عن عائشہؓ ص ۵۱۳)

بعثت ونبوت

جب آپؐ کی عمر قمری حساب سے چالیس سے ایک دن اوپر ہوئی، وہ دوشنبہ کا دن تھا، تو حضرت روح الامین علیہ السلام حکمِ نبوت لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس تشریف لائے، اس وقت آپؐ غارِ حرا کے اندر عبادت میں مصروف تھے، حضرت روح الامین علیہ السلام نے فرمایا: محمدؐ! بشارت قبول کیجیے، آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرئیل ہوں!

تبلیغ کا آغاز

اس کے بعد ایک عرصہ تک سلسلۂ وحی بند رہا، یہی فطرتِ وحی کا زمانہ کہلاتا ہے۔ پھر وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو آپؐ نے دامنِ کوہ سے واپس ہوکر تبلیغ شروع فرمادی، یہاں سے تبلیغِ اسلام اور اشاعتِ دین کا آغاز ہوا؛ بل کہ یوں کہا جائے تو بیجانہ ہوگا کہ مصائب وآلام کا دور شروع ہوا، جب آنحضرت نے نبوت اور وحدتِ خداوندی کا اعلان فرمایا تو خواتین میں خدیجہ رضی اللہ عنہا، دوستوں میں ابوبکر رضی اللہ عنہ، بچوں میں علی رضی اللہ عنہ، غلاموں میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

اور باندیوں میں حضرت ثویبہ مشرف باسلام ہوئے، یہ سب وہ حضرات اور شخصیات ہیں، جو آپؐ کے چالیس سال کے لمحہ لمحہ اور ہر ہر حرکت وسکون سے واقف تھے، ان سب کا اولِ وہلہ میں مسلمان ہوجانا آپؐ کی اعلیٰ صداقت اور راست بازی کی قوی دلیل ہے؛ لیکن قریش میں کھلبلی مچ گئی اور وہ لوگ جو زنا، جوا، قتل، عہد شکنی، آوارگی، ہر ایک قانون ووعدہ کی بندش وقیود سے آزاد رہنے، بے شمار عورتوں کو گھر میں ڈال رکھنے کے عادی تھے اور قانونِ اسلام انکو اپنی پیاری بل کہ محبوب ترین عادت کا دشمن معلوم ہوتا تھا، لہٰذا انھوں نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت پر کمر باندھ لی اور اسلام کا نام ونشان مٹانے کا فیصلہ کرلیا، چنانچہ وہی قبائلِ قریش جو آپ ﷺ کو پیار ومحبت دیتے تھے، جان کے دشمن بن گئے، جو ادب واحترام کرتے تھے، اب وہ نام لینا بھی گوارہ نہ کرتے تھے نام ونشان مٹانے کے درپے ہوگئے، وہی چچا جو خوشی میں باندی کو آزاد کرچکا تھا، طرح طرح سے تکالیف پہنچانے لگا۔

رحمۃ للعالمین کے ساتھ قریش کی بدسلوکیاں

بسا اوقات نبی ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے؛ تاکہ پاؤں مبارک زخمی ہوں، آپؐ کے دروازے پر غلاظتیں اور گندی چیزیں پھینکی جاتیں؛ تاکہ صحت اور جمعیتِ خاطر میں خلل پیدا ہو، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا چشم دید بیان ہے کہ ایک روز آپ ﷺ صحن کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، عتبہ بن ابی معیط آیا اور اپنی چادر کو لپیٹ کر رسّی جیسا بنایا جب اللہ کا رسول ﷺ سجدہ میں گیا تو چادر حضرت کی گردن میں ڈال کر پیچ پر پیچ دینے شروع کئے اور آپؐ کی مبارک گردن بہت بھنچ گئی تاہم رسول اللہ اسی اطمینانِ قلب سے سجدے میں پڑے رہے؛ تاآنکہ ابوبکرؓ وہاں آئے، انھوں نے عتبہ کو دھکا دے کر ہٹایا اور فرمایا جو آیت مبارکہ ہے: أتقتلون رَجُلاً أنْ یقولَ ربّی اللّٰہُ وقد جائکم بالبینات (کیا تم ایسے بزرگ آدمی کو مارتے ہو اور صرف اس جرم میں کہ وہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتا ہے اور تمہارے پاس روشن دلائل بھی لے کر آیا ہے) (رحمۃ للعالمین بحوالہ بخاری شریف باب مالقی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من المشرکین)

ایک اور واقعہ ہے کہ آپؐ حرم شریف میں نماز میں مشغول تھے اور قریش بھی بیٹھے ہوئے تھے مردود ابوجہل نے کہا کہ آج شہر میں فلاں جگہ اونٹ ذبح ہوا ہے اوجھڑی پڑی ہوئی ہے، کوئی جاکر اٹھالائے بدبخت عتبہ اٹھا اور نجاست بھری اوجھا اٹھالایا جب نبی ﷺ سجدے میں گئے تو مبارک پیٹھ

پر رکھ دی، آنحضرت تو رب العزت کی طرف متوجہ تھے کچھ خبر بھی نہ ہوئی کفار مارے خوشی اور ہنسی کے لوٹے جاتے تھے۔

ایذا رسانی کی باقاعدہ کمیٹی

نبی ﷺ پر جو ظلم وزیادتی اور جور وستم ہو رہے تھے کفار قریش انھیں ہنوز ناکافی سمجھتے تھے، چنانچہ متفرق کوششوں کے لیے باقاعدہ کمیٹی تشکیل دی، جس کا میرِ مجلس اور امیر عبدالعزیٰ ابولہب مقرر ہوا اور مکہ کے پچیس رؤسا اور سرداراس کے ممبران منتخب ہوئے، اس کمیٹی کی مہم اور ذمہ داری یہ طے ہوئی کہ جو لوگ دور دراز کے علاقوں سے مکہ آئیں، انھیں اللہ کے نبی محمد ﷺ کے متعلق کہا جائے؛ تاکہ وہ ان کی باتیں نہ سنیں اور ان کی عظمت اور توحید ورسالت کے قائل نہ ہوں، ایک نے کہا کہ ہم کاہن بتلائیں گے، ولید بن مغیرہ بولا میں نے بہت سے کاہن دیکھے ہیں، ان کی باتوں میں اور محمد ﷺ کی باتوں میں یگانگت نہیں ہے؛ اس لیے عرب ہمیں جھوٹا کہیں گے، پس کچھ اور کہا جائے، دوسرے نے کہا دیوانہ کہیں گے، ولید نے کہا محمدؐ کو دیوانگی سے کیا نسبت ہے، ایک بولا ہم شاعر کہیں گے، ولید بولا ہم خوب جانتے ہیں کہ شعر کیا ہوتا ہے، اصنافِ سخن ہم کو بخوبی معلوم ہیں محمدؐ کے کلام کو شعر سے ذرہ بھی مشابہت نہیں، کسی نے کہا ہم جادوگر کہیں گے ولید نے کہا محمدؐ جس طہارت، نفاست اور لطافت سے رہتا ہے وہ ساحروں اور جادوگروں میں کہاں ہوتی ہے، سب نے عاجز وقاصر ہوکر کہا چچا آپ ہی بتائیں ہم کیا کہیں، ولید نے کہا کہ کہنے کے لیے بس ایک بات ہے کہ اس کے کلام میں کچھ ایسا اثر ہے جس سے باپ بیٹے، بھائی بھائی اور میاں بیوی میں جدائی ہوجاتی ہے؛ اس لیے اس کی باتوں کے سننے سے بچا جائے اور پرہیز کیا جائے یہ تجویز منظور ہوگئی۔ (سیرت ابن ہشام، ج۱، ص۹۰)

دوسری کمیٹی یہ بنائی گئی کہ محمدؐ کو طرح طرح سے دق اور پریشان کیا جائے، بات بات میں اس کی ہنسی اڑائی جائے، تمسخر اور ایذا سے اُسے سخت تکالیف دی جائیں اور محمدؐ کو سچا جاننے اور ماننے والوں کو انتہائی درجہ کی تکالیف سے دوچار کیا جائے۔

جاں نثاروں پر ظلم وستم

چنانچہ تمام مسلمانوں اور ہمدردانِ نبی کو شعب ابی طالب میں بائیکاٹ کرکے قید کیا گیا،

حضرت بلال حبشیؓ کو امیہ بن خلف گلے میں رسی ڈال کر اوباش لڑکوں کو دے دیتا وہ ان کو پہاڑوں اور پتھروں میں گھسیٹتے پھرتے، مکہ کی گرم اور تپتی ریت پر انہیں لٹا دیا جاتا اور گرم پتھر ان کی چھاتی پر رکھ دیے جاتے، مشکیں باندھ کر لاٹھی ڈنڈوں سے پیٹا جاتا، دھوپ میں بٹھا دیا جاتا، بھوکا پیاسا رکھا جاتا، حضرت بلالؓ ان تمام ایذاؤں پر صبر فرماتے تھے، ایک مرتبہ صدیق اکبرؓ نے دیکھ لیا تو خرید کر آزاد فرما دیا، حضرتِ عمارؓ، ان کے والد حضرت یاسرؓ اور والدہ حضرت سُمیّہؓ کو مختلف سزائیں دی جاتی تھیں، مردود ابن ہشام ابوجہل نے ایک برچھا حضرت سمیہؓ کی اندام نہانی پر مارا جس سے بیچاری انتقال کر گئیں اور اسلام میں پہلی شہادت پیش کرنے والی خاتون ہوئیں۔ حضرت ابوفکیہہؓ جن کا نام افلح تھا ان کے پاؤں میں زنجیریں باندھ کر پتھریلی زمین پر گھسیٹا جاتا، حضرت خباب بن ارتؓ کے سر کے بال کھینچے جاتے، گردن مروڑی جاتی اور بارہا آگ کے دہکتے ہوئے شعلوں اور انگاروں پر لٹایا جاتا، حضرت عثمان بن عفانؓ کے اسلام لانے کا علم جب ان کے چچا کو ہوا تو کمبخت حضرت عثمانؓ کو کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر باندھ دیتا اور نیچے سے دھواں دیا کرتا تھا، حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کی والدہ نے گھر سے نکال دیا تھا جرم صرف اسلام کا قبول کرنا تھا، بعض جاں نثاروں کو قریش گائے اور اونٹ کے چمڑوں میں لپیٹ کر دھوپ میں پھینک دیتے تھے اور بعض کو لوہے کی زرہیں پہنا کر پتھروں پر گرا دیتے تھے، انتہا یہ ہوئی کہ گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا، کبھی اسلام کے شیدائی حبشہ کی جانب ہجرت کرتے ہیں اور کبھی یثرت (مدینہ منورہ) کی طرف اور شہر چھوڑنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑا کبھی نجاشی کے دربار میں مسلمانوں کے خلاف شکایات لے کر گئے اور کبھی مدینہ پر بار بار چڑھائی کر کے مسلمانوں اور اہل اِسلام کو پریشان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی؛ لیکن ہجرتِ مدینہ اور ہجرتِ حبشہ اسلام کی ترقی کے لیے سنگِ میل ثابت ہوئیں؛ چنانچہ اسلام کو رفتہ رفتہ عروج ہوتا رہا۔

قریش کی عہد شکنی

کفارِ مکہ ابھی تک اپنی حرکات سے باز نہیں آئے تھے کہ اسی دوران صلح حدیبیہ کا واقعہ بھی پیش آیا اور کفارِ مکہ نے اپنی دیرینہ عادت کے موافق صلح کی خلاف ورزی کی؛ کیونکہ معاہدہ تھا کہ دس سال تک باہم جنگ اور لڑائی نہیں ہوگی اور جو قبائل چاہیں قریش سے مل جائیں اور جو چاہیں مسلمانوں سے مل جائیں، پس بنوبکر نے قریش کا ساتھ دینا پسند کیا اور بنوخزاعہ نے مسلمانوں سے معاہدہ کیا، وہ

مسلمانوں کے حلیف ہوگئے، ابھی صلح حدیبیہ کو دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کیا اور قریش نے اسلحہ سے بنوبکر کی امداد کی، مزید برآں عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو اور صفوان بن امیہ نے جو سردارانِ قریش تھے نقاب اوڑھ کر اپنے حوالی اور موالی کے ساتھ حملہ میں بنوبکر کا ساتھ دیا، لہٰذا اللہ کے نبیؐ اپنے حلیف اور دوست قبیلے بنوخزاعہ کی حفاظت کی غرض سے دس ہزار کی جمعیت لے کر ماہِ رمضان ۸ھ میں مکہ کی جانب روانہ ہوئے اور آپؐ کا قصد یہ تھا کہ اہل مکہ کو اس آمد کی خبر اور اطلاع نہ ہونے پائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، جب آپ ﷺ مکہ کے باہر خیمہ زن ہوگئے اور اہل مکہ کو باخبر کرنے کے لیے لشکر میں الاؤ رشن کرنے کا حکم فرمایا تب ان کو خبر ہوئی، رات میں قیام کے بعد صبح کے وقت لشکر اسلام کو مختلف راستوں سے شہر میں داخلہ کا حکم فرمایا اور درج ذیل ہدایات اور احکام پر عمل کرنے اور پابندی کرنے کی تاکید فرمائی: (۱) جو شخص ہتھیار پھینک دے اسے قتل نہ کیا جائے (۲) جو شخص خانہ کعبہ میں چلا جائے اسے قتل نہ کیا جائے (۳) جو اپنے گھر میں بیٹھ جائے اسے قتل نہ کیا جائے (۴) جو شخص ابوسفیان کے گھر چلا جائے اسے قتل نہ کیا جائے (۵) جو شخص حکیم بن حزام کے گھر چلا جائے اسے قتل نہ کیا جائے (۶) بھاگنے والوں کا تعاقب نہ کیا جائے (۷) زخمی کو قتل نہ کیا جائے (۸) قیدیوں، بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے، یہ ہدایات اس شخص اور مظلوم کی اس ظالم قوم کے لیے ہیں جس نے جینا دوبھر اور زندگی حرام کر رکھی تھی، یہی ہے صفتِ رحمۃ للعالمین ﷺ بہرکیف مختلف راستوں سے داخل ہونے والے اسلامی دستوں میں سے صرف حضرت خالد بن ولیدؓ کے دستہ سے کچھ تعارض ہوا، جس میں معارضین کو بھاگنے کی نوبت پیش آئی، باقی تمام دستے بلا مزاحمت داخلِ شہر ہوگئے، آج وہ قوم جو مغلوب ومقہور ہوکر ہجرت پر مجبور ہوئی تھی وہی فاتحانہ شان وشوکت کے ساتھ مکہ میں داخل ہورہی تھی؛ اس لیے بعض حضرات کی زبان پر بے ساختہ یہ جملہ آگیا الیوم یوم الملحمہ (آج مقابلہ اور بدلے کا دن ہے) لیکن قربان جایئے اللہ کے نبی رحمۃ للعالمین ﷺ پر کہ فوراً روکا اور فرمایا کہ کہو الیوم یوم المرحمہ (آج رحم کرنے اور معاف کرنے کا دن ہے) خدا کے برگزیدہ رسول ﷺ ۲۰/رمضان ۸ھ کو جب مکہ میں داخل ہوئے اس وقت سر جھائے سورہ الفتح کی تلاوت میں مصروف تھے اور اونٹ پر سوار ہوکر بیت اللہ کی جانب چلے جارہے تھے، وہاں پہنچ کر خدا کے مقدس گھر کو بتوں کی آلائش سے پاک فرمایا، اس وقت خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، اللہ کے رسول ﷺ کمان کے گوشے یا چھڑی کی نوک سے ہر ایک بت کو گراتے جاتے اور زبانِ مبارک سے پڑھتے جاتے تھے جاء الحقُ

وزَهَقَ البَاطِلُ إنَّ البَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (حق کا غلبہ ہوا اور باطل ملیا میٹ ہوا اور وہ اُسی لیے ہے) جَاءَ الحَقُّ وما يُبْدِئُ الباطِلُ وَمَا يُعِيْدُ (حق آ گیا اور باطل نہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا) پھر رحمۃ للعالمین نے کعبۃ اللہ کے کلید بردار عثمان بن ابی طلحہ کو بلا کر چابی لی پھر خانہ کعبہ میں جا کر ہر ہر گوشہ میں اللہ اکبر کے ترانے گائے، شکرانے کی نماز ادا کی پھر نہایت عجز وانکساری کے ساتھ اللہ رب العزت کے سامنے پیشانی خاک پر رکھ دی، اسی دوران وہ تمام بڑے بڑے لوگ اور سردارانِ قریش جمع ہو گئے، جنھوں نے متعدد مسلمانوں اور اسلام کا نام لینے والوں کو شہید کیا یا کرایا تھا، سیکڑوں نبی کے جاں نثاروں کو ایذائیں اور تکالیف دے کر گھر بار چھوڑنے اور مکہ سے نکلنے پر مجبور کیا تھا، دین اسلام کو تباہ و برباد کرنے میں اور مسلمانوں کو ذلیل ورسوا کرنے میں حبشہ، شام، نجد اور یمن تک کے سفر کیے تھے، جنھوں نے مدینۃ الرسول ﷺ پر بار بار حملے کئے تھے، مکہ سے ساڑھے تین سو میل دور بھی خدا کے نبیؐ اور اس کے ماننے والوں کو چین کی سانس نہیں لینے دی تھی، حاصل یہ ہے کہ جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کو فنا کرنے میں زر سے، زور سے، تدبیر سے، ہتھیار سے اور تزویر سے اپنا سارا زور صرف کر چکے تھے اور اکیس سال تک اپنی ناکام کوششوں میں برابر منہمک رہے تھے، آج رحمۃ للعالمین ﷺ کے سامنے سر جھکائے رحم کی درخواست زبانِ حال وقال سے کر رہے تھے اور خدا کے وہ رسول ﷺ جو رحمۃ للعالمین کی شان کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے اس جماعت اور گروہِ قریش کی طرف نگاہِ رحمت سے دیکھ رہے تھے اور اپنی شانِ رحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام حالات کو نظر انداز فرما کر زبانِ رحمت سے کہہ رہے تھے:

يَا مَعْشَرَ قُرَيش! إنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عنكم نخوة الجَاهِلِيَّةِ وتَعَظُّمَها بالأبَاءِ، الناسُ مِنْ آدَمَ وآدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ ثم تَلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَأيُّهَا النَّاسُ إنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ أكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أتْقَاكُمْ (سورۃ الحجرات)

اے گروہِ قریش! خدا نے تمہاری جاہلانہ نخوت اور آبا واجداد پر اترانے کا غرور آج توڑ دیا (سچ تو یہ ہے) سب لوگ آدم علیہ السلام کے فرزند ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد وعورت سے بنایا اور خاندان وقبیلے سب جان پہچان کے لیے بنائے ہیں اور خدا کے یہاں تو اس کی عزت زیادہ ہے، جس میں تقویٰ زیادہ ہو۔

پھر رحمۃ للعالمین ﷺ نے فرمایا اے سردارانِ قریش! اللہ کے رسول سے کس طریقہ کے برتاؤ کی توقع لے کر آئے ہو؟ مکہ والوں نے کہا کہ ہمیں اپنے سردار کے فرزند سے عمدہ سلوک اور اچھے برتاؤ کی امید اور توقع ہے رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ: آج تمہارے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا، لہٰذا تمام لوگوں کو معاف فرما کر صرف ایسے حضرات کے لیے فرمایا جو زندگی بھر اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے سب سے بڑے دشمن تھے کہ جہاں ملیں قتل کردیا جائے ایسے لوگوں کی تعداد بھی پندرہ سولہ سے متجاوز نہ تھی؛ لیکن ان میں بھی جو مسلمان ہوکر رحمتِ دوعالم ﷺ سے رحم کی درخواست کرتے، انہیں بھی معافی دے کر صلہ رحمی کی مثال قائم فرمادی۔

حرفِ آخر

رحمتِ دوعالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور مبارک زندگی کو تین ادوار اور حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) بعثت ونبوت سے قبل چالیس سال اس پوری مدت اور پورے عرصے میں تمام قریش خواہ اپنے ہوں یا پرائے، چھوٹے ہوں یا بڑے سب ہی آمنہ کے لعل اور عبداللہ کے فرزند پر جاں نثار تھے، شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے اور ادب واحترام کی وجہ سے نام نہ لے کر صادق اور امین کے لقب سے پکارتے تھے۔

(۲) دوسرا دور بعثت ونبوت کے بعد سے فتح مکہ تک، اکیس سال اس عرصے میں صورتِ حال یکسر بدل گئی تھی اور قریش کا بچہ بچہ اللہ کے رسول ﷺ کا جانی دشمن تھا اور عداوت ودشمنی میں بھی حد سے متجاوز تھا اور صورتِ حال کے بدلنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ قریش کو اپنی آزادخیالی، بے مہار زندگی اور مذہب وقانون کی بندشوں سے بے پرواہ رہنے جیسی عادت کے لیے اسلام اور بانیِ اسلام دشمن نظر آتے تھے، لہٰذا مذہبِ اسلام اور اسلام کا نام لینے والوں کا نام ونشان مٹانا انھوں نے اپنا مقصدِ زندگی بنالیا تھا۔

(۳) تیسرا دور فتح مکہ سے شروع ہوتا ہے یہ دور مندرجہ دوسرے دور سے بالکل مختلف تھا کہ جو قوم پہلے طاقتور اور زورآور تھی وہ اب کمزور وناتواں ہوچکی تھی اور جو حضرات دوسرے دور میں بے سروسامانی کے عالم میں تھے وہ خداوند عالم کے فضل وکرم سے بھاری جمعیت اور ساز وسامان سے آراستہ ہوچکے تھے اور صورتِ حال اس لحاظ سے بھی بدلی ہوئی تھی کہ دوسرے دور

میں جو قوم طاقتور اور زور آور تھی وہ کمزوروں پر ظلم وستم کو روا رکھتی تھی بل کہ کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی اور جو حضرات اس تیسرے دور میں غالب تھے وہ ظلم تو کجا بدلہ لینے کو جائز نہیں کہہ رہے تھے جب کہ عالمی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمیشہ فاتح قوم نے مفتوحوں پر ظلم کیا ہے؛ لیکن یہ قوم اقوام کی تاریخ سے سبق لینے یا اس پر عمل کرنے کے لیے نہیں؛ بل کہ ایک ایسی نئی تاریخ رقم کرنے والی قوم تھی اور ہے، جسے تا ابد اقوامِ عالم دیکھتی رہیں اور اس سے سبق لے کر عالم کو فتح کرنے کا راستہ ہموار کریں، اسی کو سیرت نگار اور مؤرخ اسلام لکھتے ہیں کہ: اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا؛ بل کہ اسلام کی نشر واشاعت اخلاقِ حسنہ کے ذریعہ ہوئی ہے اور فتح مکہ اس کی زندۂ جاوید مثال ہے کہ قریش کا غرور اور گھمنڈ خاک میں مل چکا تھا اور اپنی زندگی کی بھیک مانگنے کے لیے بیت اللہ شریف میں جمع تھے، اُدھر اللہ کا وہ رسول ﷺ جو آٹھ سال پہلے اسی مادر وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا اور ساڑھے تین سو میل کے فاصلے پر بھی قریش سے متعدد مرتبہ دق اور پریشان ہو چکا تھا، اگر چاہتا تو بیک زبان ان کی گردن کاٹنے کا حکم فرماتا؛ کیوں کہ ان میں مسلمانوں کے قاتل، نبی ﷺ کے بڑے بڑے دشمن، اسد اللہ حضرت حمزہؓ کا قاتل، ان کی مبارک نعش کی بے حرمتی کرنے والا اور حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبانے والی وغیرہ وغیرہ ایسے بہت سے تھے جن سے نا بھولنے والی ایذائیں اور تکالیف پہنچی تھیں، لیکن اللہ کے رسول رحمۃ للعالمین ﷺ ہیں اور وہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ کو دوبارہ زندہ فرمانے والے ہیں، لہٰذا وہی معاملہ فرمایا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا آپ نے فرمایا کہ تم سب پر آج کوئی گرفت نہ ہوگی؛ چنانچہ اس اخلاق کا اثر یہ ہوا کہ وہ سب مسلمان ہو گئے، یہ ہے اشاعتِ اسلام کا اصل سبب، اللہ رب العزت تمام ملت کو اخلاقِ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر عمل کرنے کی سعادتِ عظمیٰ نصیب فرمائے، آمین ثم آمین۔

❁ ❁ ❁

قرآن کریم کی روشنی میں افراد سازی

(۱)

از: اختر امام عادل قاسمی
مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور، بہار

قرآن دینِ کامل کی ایک نمائندہ کتاب ہے، یہ ایسی کتابِ ہدایت ہے، جو انسانیت کو سب سے سیدھی اور معتبر راہ دکھاتی ہے، إنّ هذا القرآنَ يهدي لِلَّتِي هِيَ أقوَمُ (الاسراء:۹)

ترجمہ: بیشک یہ قرآن سب سے سیدھے اور مضبوط راستے کی رہنمائی کرتا ہے۔

یہ روشنی کا پیغامبر ہے، یہ ایک مینارۂ نور ہے، جس سے سارا عالم رہتی دنیا تک تاریکی سے نجات پاتا رہے گا۔

قَدْ انزلَ اللّٰهُ إليكم ذكرًا، رسولاً يتلوا عليكم آيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّناتٍ لِيُخرِجَ الذينَ آمَنوا وعَمِلوا الصٰلحٰتِ من الظلمٰتِ إلى النور. (الطلاق:۱۰-۱۱)

ترجمہ: اللہ نے تمہارے لیے قرآن نازل کیا، رسول تم پر اللہ کی واضح آیات پڑھ کر سناتے ہیں؛ تاکہ ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔

یہ ایک نسخۂ کیمیا ہے جو خاک کو کیمیا اور ذرہ کو جوہر بناتا ہے، اس میں بیماروں کے لیے شفا اور صحتمندوں کے لیے سامانِ سکون ہے، یہ خدا کا ایسا قیمتی اور عظیم الشان عطیہ ہے کہ اگر مضبوط اور بلند وبالا پہاڑوں پر اتارا جاتا تو وہ اس کا وزن برداشت نہ کر پاتے اور ہیبت سے ریزہ ریزہ ہوجاتے:

لَو انزلنا هٰذا القرآنَ على جبلٍ لَرَأيتهٗ خاشعاً متصدعاً مِنْ خَشيةِ اللّٰه (الحشر:۲۱)

ترجمہ: ''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ لرزہ براندام ہے اور ہیبتِ الٰہی سے ریزہ ریزہ ہوچکا ہے۔''

قرآن آج بھی تمام طاقتوں کا سرچشمہ اور ساری مشکلات کا حل ہے، جس طرح قرآن نے صدیوں پیشتر ایک حد سے زیادہ گری ہوئی قوم کو بلندیوں کے آسمان پر پہنچادیا تھا اور اسی کتابِ

ہدایت کی بدولت ایک انتہائی پچھڑا ہوا معاشرہ دنیا کے سب سے ترقی یافتہ اور مہذب معاشرہ میں تبدیل ہوگیا، جن لوگوں کو کسی مہذب اور شریف آدمی کی نقل اتارنے کا سلیقہ نہیں تھا، وہ ساری مذہب اور تعلیم یافتہ دنیا کے لیے آئیڈیل بن گئے، جن کو اپنا چھوٹا سا گاؤں چلانے کی لیاقت نہیں تھی، ان میں پوری روئے زمین پر حکمرانی کی اہلیت پیدا ہوگئی، جن کو ایک چھوٹی سی سوسائٹی پر کنٹرول نہیں تھا اور جو ساری دنیا میں اپنی خانہ جنگی اور سر پھٹول کے لیے بدنام تھے، ان کو ایسا قانون مل گیا جس نے ساری انسانیت کو ایک لڑی میں پرودیا،... یہ سب اسی کتابِ مقدس کا اعجاز تھا...اس کی معجزانہ قوتیں آج بھی زندہ ہیں، ان کو برتنے اور استعمال میں لانے کی ضرورت ہے، آج اس کتابِ ہدایت کو ہم نے سرد خانے میں ڈال دیا ہے اور اس ہدایت وانقلاب والی کتاب کو صرف ایک برکت والی کتاب میں تبدیل کردیا ہے۔

ضرورت ہے کہ جائزہ لیا جائے کہ وہ کیا چیزیں تھیں، جن کو برت کر ایک گئی گذری قوم اتنی آگے بڑھ گئی اور وہ کیا باتیں تھیں، جن کو چھوڑ کر آسمان کی بلندیوں سے باتیں کرنے والی قوم پستی کی گہرائیوں میں چلی گئی، بقول ڈاکٹر اقبالؒ:

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

قرآن آج بھی قوموں اور افراد کو بنانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، شخصیتوں کی تعمیر کا نسخہ آج بھی پوری طرح کارگر ہے، قرآن کا دامن اس قسم کے شہ پاروں سے بھرا پڑا ہے، ہم ان میں سے بطورِ نمونہ چند کو ذکر کرتے ہیں:

قوتِ ایمانی

جہاں تک میں نے قرآن کو پڑھا ہے، قرآن نے سب سے زیادہ زور ایمان ویقین پر دیا ہے، کسی فرد یا قوم کی تعمیر میں سب سے بڑا رول اسی قوتِ ایمانی کا ہے، ایمان کا درجہ فرد یا قوم کی زندگی کے لیے روح کا ہے، یہ شخصیت کو زندگی اور زندگی کو توانائی بخشتا ہے، اس کے بغیر دنیا میں نہ کوئی پنپ سکتا ہے اور نہ ابھر سکتا ہے، شخصیت بنتی ہے اسی بنیاد پر، اس کو ہٹا کر کی جانے والی ہر کوشش فقط خسارہ کا سودا ہے، جس کا نظارہ ہر دور میں چشمِ فلک نے کیا ہے اور جس پر ماہ وسال کی گردشیں گواہ ہیں، قرآنِ کریم نے صدیوں کے اسی تجربہ پر تصدیق کی مہر لگائی ہے:

والعصرِ إنَّ الانسانَ لَفِي خُسُر، إلَّا الذينَ آمنوا وعَمِلوا الصالحاتِ وتَواصَوا

بالحق و تَوَاصَوا بالصبر (العصر)

ترجمہ: قسم ہے زمانے کی، بیشک انسان گھاٹے میں ہے سوائے ایمان والوں کے جنھوں نے نیک اعمال کیے، ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی تلقین کی۔

یہ سورت شخصیت سازی کے مسئلے میں سب سے مرکزی حیثیت رکھتی ہے، اس سورۃ کا موضوع ہی انسانیت کی تعمیر اور نفع ونقصان کے معیار کا تعین ہے، قرآن پورے یقین کے ساتھ (اور قرآن کا ہر بیان یقینی ہوتا ہے) اور ہر قسم کے شک وشبہ کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: جولوگ ایمان والے نہیں ہیں، وہ گھاٹے میں ہیں، اگر چہ کہ وہ بظاہر نفع میں دکھائی دیں، اور اگر کوئی صاحبِ ایمان گھاٹے میں دکھائی دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اُسے اپنے ایمان پر محنت کرنی چاہیے، قرآنِ کریم نے ایسے ایمان والوں کو ہدایت کی ہے:

یٰأیھا الذین آمنوا آمِنوا (اے ایمان والو! تجدیدِ ایمان کرو)

قرآن اور صاحبِ قرآن نے نزولِ قرآن کے آغاز سے پوری مکی زندگی صرف ایمان کی محنت پر گذاری اور عمل کی جگہ پر نماز اور تلاوتِ قرآن کے علاوہ کوئی حکمِ شرعی بندوں کو نہیں دیا گیا، بندوں میں یہ یقین بنایا گیا کہ اصل چیز اللہ کی رضا ہے، ساری محنت اسی لیے کی جانی چاہیے کہ اللہ ہم سے راضی ہوجائے اس لیے زندگی کے ہر مسئلے میں یہ دیکھنا ہوگا کہ اللہ کی مرضی کیا ہے؟ اللہ کی مرضی اور اس کا حکم جان لینے کے بعد پھر اپنی کوئی مرضی باقی نہیں رہ جاتی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنِ الحکمُ اِلاّ للّٰہِ علیہ توکلّتُ و علیہ فلیتوکل المتوکلون (یوسف:۸)

ترجمہ: ''فیصلہ صرف خدا کا چلے گا، اسی پر میرا بھروسہ ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔''

وَمن لم یَحکُمُ بما انزلَ اللّٰہ فاولٰئک ھم الفاسقون. (مائدہ:۷)

ترجمہ: ''اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق جولوگ فیصلہ نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔''

ما کان لمؤمنٍ و لا مؤمنة إذا قضی اللّٰہُ و رسولُہ أَمرًا أن یکونَ لھم الخِیَرة.

ترجمہ: ،،جب اللہ اور اس کے رسول نے کسی قضیہ میں فیصلہ سنادیا تو پھر کسی مؤمن مرد یا عورت کے لیے اختیار باقی نہیں رہ جاتا۔''

نماز اور تلاوتِ قرآن بھی اگر چہ عمل کے درجہ کی چیز ہے؛ لیکن یہ بھی ایمان ہی کا تکملہ ہیں، ایمان کو غذا انھیں کے وسیلے سے ملتی ہے، خدا سے رابطہ کا یہی ذریعہ ہیں، بندہ انھیں واسطوں سے

اپنے رب سے ہم کلام ہوتا ہے، یہ دونوں چیزیں عبد ومعبود کے رشتے کو مضبوط کرتی ہیں، اس طرح گویا یہ بھی ایمان ویقین ہی کا حصہ ہیں۔

ایمان نام ہے دل سے مان لینے کا اور اسلام نام ہے سرِ تسلیم خم کردینے کا، جس کو قرآن اتباع، اطاعت اور انقیاد وغیرہ اصطلاحات سے ذکر کرتا ہے، قرآن اپنے ماننے والوں کا شروع سے یہ ذہن بناتا ہے کہ رب کے سامنے اپنے کو ہر طرح سرینڈر کردینا ہی بندگی ہے، ایسے لوگوں کو قرآن رضوانِ الٰہی کا پروانہ دیتا ہے:

رضی اللّٰہ عنھم و رَضُوا عنہ، ذٰلك لِمنْ خَشِیَ ربَّہٗ (سورۂ بَیِّنہ:۸)

ترجمہ: ''اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں، یہ سعادت رب سے ڈرنے والوں کو ملتی ہے۔''

قرآن نے یہ فکر دی ہے کہ قوتوں کا سرچشمہ رب العالمین ہے، موت وحیات کے تمام مسائل کی ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے، مال واسباب صرف ظاہری ذرائع ہیں، نہ یہ کسی کو زندگی دے سکتے ہیں اور نہ کسی مسئلے کو بنا سکتے ہیں، فیصلے تمام تر احکم الحاکمین کے دربار سے ہوتے ہیں:

أیحسب أن مالَہٗ أخلَدَہٗ، کلاّ لَیُنبَذَنَّ في الحُطَمۃ (سورۂ ھمزۃ:۳،٤)

ترجمہ: ''کیا وہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا ہرگز نہیں یہ سارا مال جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

اِنْ یَنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فلا غالبَ لَکُم واِن یَخْذُلْکُم فمن ذا الذی ینصرُکم من بعدہٖ فلیتوکل المتوکلون (آل عمران:۱۷)

ترجمہ: ''اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، اور اگر اللہ تمہیں رسوا کریں تو پھر اس کے بعد تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا، پس بھروسہ صرف اللہ پر کرنا چاہیے۔''

اس طرح کی بیشمار آیات ہیں، جن میں قرآن نے بندہ کا رشتہ پروردگار سے جوڑنے پر زور دیا ہے اور جب بندہ کا تعلق اپنے رب سے ہوجاتا ہے، تو دنیا کے سارے رشتے اس کے زیرِ سایہ چلے آتے ہیں، انسان میں خدا اعتمادی سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، انسان کے دل میں اپنے پروردگار کی بنائی ہوئی ایک ایک چیز سے پیار جاگ جاتا ہے، اور تمام وہ اچھی باتیں جو اللہ کو پسند ہیں، وہ ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ہر ایسے کام سے ڈرتا ہے، جن سے پروردگار ناراض ہوتا ہے، اس طرح انسان فضائل واخلاق کا پیکر، امن ومحبت کا پیامبر اور خداشناشی وخودشناشی کا سنگم بن جاتا ہے، اس کو دیکھنے سے خدا یاد آتا ہے، اس کی پیشانی میں خدا کا نور جھلکتا ہے، اس کے

پاس بیٹھنے کو جی چاہتا ہے، اس کی باتیں دل میں اترتی چلی جاتی ہیں، اس طرح ایک معیاری اور تعمیر پسند سوسائٹی کی بنیاد پڑتی ہے...

تو انسان کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے بڑا حصہ ایمان ویقین کا ہے، یہ نہ ہوتو ساری چیزیں کھوکھلی ہیں۔

حسنِ عمل

انسان کی شخصیت کی تعمیر میں دوسرا اہم ترین درجہ عملِ صالح کا ہے، قرآنِ کریم نے سورۂ والعصر میں اس کو دوسرے مقام پر رکھا ہے، جو لوگ آرزوؤں اور خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں اور کام سے زیادہ منصوبے بنانے پر اپنے اوقات صرف کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا میں ان کی تعریف ہو، قرآن ان کو متوجہ کرتا ہے کہ اچھے کاموں کے بغیر دنیا یا آخرت میں کوئی اچھا انسان نہیں بن سکتا، اچھی شخصیت اچھے کاموں سے بنتی ہے، پھر اچھے اعمال کی ایک طویل فہرست ہے، جو قرآن میں بکھری پڑی ہے، اہلِ علم ان سے بخوبی واقف ہیں، بطورِ نمونہ ایک دو آیات کا حوالہ دیتا ہوں:

سورۂ مؤمنون کی درج ذیل آیت میں بعض اعمال کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کو کامیابی کا مدار قرار دیا گیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ المؤمنون الذين هُم في صلاتِهم خاشِعون والذين هُم عَنِ اللَّغْوِ مُعرِضون والذين هم للزكوٰة فاعلون والذين هُمْ لفروجِهم حافِظُون والذين هم لامٰنٰتهم وعَهْدِهم راعون والذين هم علىٰ صلاتهم حافظون (مؤمنون:۱)

ترجمہ: ”بیشک وہ ایمان والے کامیاب ہیں، جو اپنی نمازیں خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں، جو بیکار باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، جو اپنی امانتوں اور وعدوں کا لحاظ کرتے ہیں، اور جو نمازوں کے پابند ہیں۔“

سورۂ بقرہ میں ہے:

ليس البرُ اَن تُوَلّوا وُجوهكم قِبَلَ المشرقِ والمَغْرِبِ ولكنَّ البِرَّ مَنْ آمن باللّٰه واليوم الآخر والملٰئكة والكتٰب والنبيين واٰتى المالَ علىٰ حُبِّهٖ ذوى القربىٰ واليتٰمىٰ والمساكين وابن السبيل والسائلين وفى الرقاب واَقامَ الصلوٰةَ واٰتى الزكوٰةَ والموفونَ بعهدِهم إذا عاهدوا والصٰبرين في الباساءِ والضراءِ وحينَ البأسِ اولٰئك الذين صدقوا وأولٰئك هم المتقون. (بقرہ:۲۲)

ترجمہ: ''نیکی یہی نہیں ہے کہ اپنا رخ مشرق ومغرب کی جانب کرو؛ بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ اللہ پر، روز آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب اور نبیوں پر ایمان ہو (اور اعمال میں) اور مال سے بے پناہ محبت کے باوجود اس کو اپنے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور غلاموں کے آزاد کرانے کے لیے خرچ کرے، نماز ادا کرے، زکوٰۃ دے، وعدہ کرے تو اس کو پورا کرے، مصیبت وتکلیف اور جنگ میں صبر وثبات کا مظاہرہ کرے، یہی لوگ راست باز اور تقویٰ والے ہیں۔''

سورۂ فرقان میں ہے:

وعبادُ الرحمٰن الذين يَمْشُون على الارضِ هوناً وإذا خاطَبَهم الجاهلونَ قالوا سلماً والذين يبيتون لرَبِّهم سُجَّدًا قيامًا والذين يقولون ربَّنا اصرِف عذابَ جهنمَ إنَّ عذابها كان غرامًا، إنّها سَائَتْ مستقرًا ومقاماً والذين اذا انفقوا لم يسرفوا ولم يقتروا وكان بين ذٰلك قواماً والذين لايدعون مع اللّٰه الٰهاً آخر ولا يقتلون النفس التي حَرَّمَ اللّٰهُ إلّا بالحقِّ ولايزنون ومن يفعل ذٰلك يَلْقَ اثاماً... والذين لايشهدون الزورَ وإذا مرّوا باللغو مرّوا كِراماً والذين إذا ذكروا بآيٰتِ ربِّهم لم يَخِرّوا عليها صُمًّا وعُمياناً والذين يقولون ربنا هب لنا من أزواجّنا وذريّٰتنا قرةَ أعيُنٍ واجعلنا للمتقين امامًا (فرقان:٦)

ترجمہ: ''اور اللہ کے نیک بندے وہ ہیں، جو زمین پر نرمی سے چلتے ہیں اور جب ناسمجھ لوگ ان کو مخاطب کرتے ہیں تو سلام کہہ کر گذر جاتے ہیں، جو راتوں میں اٹھ کر پروردگار کے حضور سجدہ وقیام کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ اے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب دُور فرما، اس کا عذاب پوری تباہی ہے، اور وہ برا ٹھکانہ اور مقام ہے، جو خرچ میں نہ بخل کرتے ہیں اور نہ فضول خرچی کرتے ہیں؛ بلکہ اعتدال سے کام لیتے ہیں، جو اللہ کے علاوہ کسی معبود کو نہیں پکارتے، جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے، جس کو خدا نے منع کیا ہے، اور نہ بدکاری کرتے ہیں، کہ جو ایسا کرے گا وہ گنہگار ہوگا، اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے، اور جب کبھی لغویات سے گذرتے ہیں تو سنجیدگی اور وقار سے گذر جاتے ہیں، اور جب خدا کی آیات ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہوجائیں، اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔''

اسی طرح سورۂ شوریٰ، آل عمران، قصص، دہر وغیرہ میں متعدد آیات میں اعمالِ خیر کی تفصیل دی گئی ہے۔

موافق ماحول

تیسرا اہم ترین محرّک اچھا ماحول ہے، جس کو قرآن نے وتَواصوا بالحق وتواصوا بالصبر (اور ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی تلقین کریں) سے تعبیر کیا ہے اس لیے کہ جس سوسائٹی میں حق بات کہی اور سنی جاتی ہو اور جس کی بنیاد محض جذباتیت اور اشتعال کے بجائے صبر وتحمل اور ایک دوسرے کے لیے برداشت کے جذبہ پر ہو، اس سے بہتر سوسائٹی دنیا میں کیا ہوسکتی ہے؟

انسان کی ذہنی تشکیل اور شخصیت کی تعمیر میں ماحول کا بڑا حصہ ہے، انسان کو اگر اچھا ماحول اور موافق گردوپیش میسر آجائے تو اس کی شخصیت بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کرتی ہے، بہتر ماحول علم وعمل کی کمی کی بھی مکافات کردیتا ہے، یعنی علم وعمل میں انسان نسبتاً کمتر ہو؛ لیکن اسے موافق ماحول اور اچھی صحبت مل جائے تو علم وعمل کی کمی کے باوجود وہ اپنا مقام بنالیتا ہے، انسان کے آگے بڑھنے کے لیے ماحول سے بڑھ کر کوئی مددگار نہیں ہوتا، علم وعمل کی تمام خوبیوں کے باوجود اگر انسان کو موافق ماحول اور بہتر مواقع میسر نہ ہوں تو اس کی ترقی وتعمیر میں بڑی مشکلات پیش آئیں گی، علم وعمل کو ماحول ہی پروان چڑھاتا ہے، اسی لیے نماز، روزہ اور دیگر عبادات میں اللہ نے ماحول بنانے پر زور دیا ہے، یہ نماز باجماعت، رمضان کا اجتماعی روزہ، حج کا اجتماع، عید، جمعہ، کسوف، استسقاء وغیرہ کا اجتماع، یہ سب اسی لیے ہے کہ عمومی ماحول میں کوئی بڑا سے بڑا کام بھی آسان ہوجاتا ہے، اس طرح سوسائٹی کے اکثر افراد کو نیک کاموں کی توفیق ہوجائے تو ایک شاندار معاشرہ وجود میں آسکتا ہے، قرآن کریم نے درج ذیل آیت میں اسی حقیقت کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے:

كنتم خيرَ أمَّةٍ أُخرِجَتْ للناسِ تأمرون بالمعروف وتَنْهَوْن عَنِ المُنكَر.

ترجمہ: تم ایک بہتر امت ہو جو اچھائیوں کی تلقین کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو۔

قرآن زندگی کے تمام معاملات میں اسی طرح کی وحدت کو پسند کرتا ہے، اور معاشرہ کی انارکی اور انتشار کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، آیت کریمہ ہے واعتصموا بِحَبْلِ اللّٰهِ جميعاً ولا تفرَّقوا. (آل عمران:۱۰۳)

ترجمہ: اور خدا کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑلو اور باہم انتشار مت پیدا کرو۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

وأطيعوا اللّٰهَ ورسولَهٗ ولا تنازَعُوا فتفشَلُوا وتذهبَ ريحُكم (انفال:٤٦)

ترجمہ: اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ ہمت ہار بیٹھو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

قرآن چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرہ باہم محبت واخوت کی بنیاد پر ترقی کرے اور سب بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے کے مددگار رہوں:

اِنَّما المؤمنون إخوَةٌ فأصلِحوا بينَ أخوَيكم (حجرات: ۱)

سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں اس لیے اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ۔

قرآن حسب ونسب سے زیادہ دینی اخوت کا وکیل ہے:

فان لم تعلموا آباءَهُم فَإخوانُكم في الدينِ و موالیکم (احزاب: ۱)

ترجمہ: اگر تم کو ان کے خاندان کا علم نہ ہو تو وہ تمہارے بھائی اور اہلِ تعلق ہیں۔

حضور ﷺ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے (صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ، ج: ۲، ص: ۳۸۹ مصر)

آج یہی چیز مسلم سوسائٹی سے ختم ہوگئی اور وہ رنگ ونسل، خاندان، علاقہ اور زبان کی تنگ نظریوں میں مبتلا ہوگئی اور انسان کی ترقی اور اس کی شخصی تعمیر کا راستہ مشکل ہوگیا۔

حسنِ ادب

اسلام میں ادب کی بڑی اہمیت ہے، ادب سے شخصیت میں نکھار، وقار اور زندگی میں جاذبیت اور محبوبیت پیدا ہوتی ہے، اگر بچہ میں شروع سے ادب کی عادت ڈالی جائے اور اچھے آداب اسے سکھائے جائیں تو وہ بڑا انسان بن سکتا ہے اور قوم وملت کے لیے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے، زندگی کے ہر مرحلے کے لیے قرآن نے ادب کا درس دیا ہے، ہم بطور نمونہ دو تین چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں:

❁ انسان جب ایک ساتھ رہتا ہے تو ایک دوسرے کے یہاں آنے جانے کی بھی ضرورت پڑتی ہے، ایسے موقع پر اگر انسان حدود کی رعایت نہ کرے تو بہت سے فتنے پیدا ہوں گے؛ اس لیے قرآن نے اس کے لیے کچھ حدود وآداب مقرر کیے ہیں مثلاً اجازت لے کر جاؤ نیز اجازت کا طریقہ یہ ہے کہ: دروازہ سے باہر سلام کرو! ذیل کی آیت کو پڑھیے:

یٰایھا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتاً غیرَ بیوتِکم حتٰی تستأنِسُوا وتُسلِّموا علٰی اھلِھا ذٰلکُم خیر لکم لعلکم تذکرون (نور:٤)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں مت جاؤ؛ مگر اجازت لےکراور گھر والوں کوسلام کرکے، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے؛ تاکہ تم سبق حاصل کرو۔

❁ اگر دوسرے کے گھر کی عورتوں سے کچھ لینا ہوتو اس کا ادب یہ بتایا گیا:

وَإذا سَألتُموھُنَّ مِنُ وَراءِ حجاب ذلکم أطھر لقلوبِکم وقلوبِھن (احزاب:۷)

ترجمہ: جب ان گھر والیوں سے کچھ مانگو تو پردہ کے پیچھے سے مانگو، اسی میں تمہارے اوران کے دلوں کے لیے پاکی ہے۔

❁ آپس میں سلام کا ادب قرآن نے یہ بتایا کہ سلام کا جواب سلام سے بہتر ہونا چاہئے:

اذا حُییتم بتحیۃٍ فَحَیّوا بِأحسنِ منھا أورُدّوھا (نساء:۱۱)

ترجمہ: جب تم کوسلام کیا جائے تو اس کا جواب اور بہتر پیرایے میں دو یا کم ازکم اسی کو دہرادو۔

❁ حضور ﷺ سے خصوصی ملاقات کے آداب پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

یٰاھا الذین آمنوا اذا ناجیتم الرسولَ فقدِّموا بینَ یدی نَجوٰیکم صدقۃً ذٰلك خیرٌ لکم وأطھر فإن لم تجدوا فإن اللّٰہ غفور رحیم (مجادلۃ:۱۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم رسول سے اکیلے میں ملنا چاہو تو پہلے صدقہ کرو، اس میں تمہارے لیے خیر اور پاکیزگی ہے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اللہ بخشنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔

اس حکم کا ایک مخصوص پس منظر تھا جو کچھ دنوں کے بعد ختم کردیا گیا؛ لیکن فی الجملہ اس سے بڑوں کے دربار میں جانے کے آداب پر روشنی پڑتی ہے اور چھوٹوں کو کیا تیاری کرنی پڑتی ہے، اس کی حیثیت جھلکتی ہے، اور اس سے چھوٹوں میں کچھ کرنے کا جذبہ بھی بیدار ہوتا ہے۔

❁ حضور ﷺ سے گفتگو کے آداب پر قرآن نے بتایا کہ آپ سے عام لوگوں کی طرح گفتگو نہ کرو؛ بلکہ اس کا دھیان رکھو کہ تمہاری آواز نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ ہونے پائے:

یٰایھا الذین آمنوا لاترُفَعُو أصواتَکم فوقَ صوتِ النبی (حجرات)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی آواز نبی ﷺ کی آواز سے اونچی نہ کرو۔

آپ کو مخاطب کرنے کا ادب قرآن نے یہ بتایا کہ عام لوگوں کی طرح نام لے کر نہ آواز دو؛ بلکہ آپ کے شایانِ شان القاب کا استعمال کرو:

لاتجعلو دعاءَ الرسول بینکم کدعاءِ بعضِکم بعضاً

ترجمہ: رسول ﷺ کو اس طرح نہ پکارو جس طرح باہم لوگوں کو پکارتے ہو۔

کسی مجلس میں ہو تو آپس میں کانا پھوسی کرنے کو خلاف ادب قرار دیا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنّما النجویٰ من الشیطٰن (مجادلة:۲) ترجمہ: کانا پھونسی کرنا شیطان کا کام ہے۔

❁ عائلی زندگی میں ایک ساتھ رہتے ہوئے بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں اور کبھی ایک کی بات دوسرے کو پسند نہیں آتی ہے، اس تعلق سے قرآن نے ادب کی تلقین کی:

وعاشروھن بالمعروف فَإن کرھتموھن فعسیٰ أن تکرھوا شیئاً ویجعل اللّٰہ فیه خیرًا کثیراً (نساء:۳)

ترجمہ: بیویوں کے ساتھ معروف طریقے پر زندگی گذارو، اگر تم کو وہ پسند نہ آئیں تو بھی ممکن ہے کہ ایک چیز تم کو اچھی نہ لگے اور اللہ نے اس میں بہت خیر رکھا ہو۔

اسی بات کو ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا:

''اپنی بیویوں میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری بات اچھی نکل آئے گی۔'' (صحیح بخاری ومسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء)

❁ زمین پر چلنے کا ادب بتایا گیا:

ولاتمشِ في الارضِ مرحاً انك لن تخرِقَ الأرضَ ولن تبلُغَ الجبالَ طولاً (بنی اسرائیل: ٤)

ترجمہ: زمین میں اکڑ کر نہ چلو کہ نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ سکتا ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

ولا تمشِ في الارضِ مرحاً إن اللّٰہَ لا یحبُّ کلَّ مختالٍ فخور (لقمان:۲)

ترجمہ: زمین میں اکڑ کر نہ چل، بیشک اللہ کسی مغرور اور متکبر کو پسند نہیں کرتا۔

❁ گفتگو کا سلیقہ بتایا گیا کہ نرمی اور ملائمت کے ساتھ اور سامنے والے کی عزتِ نفس کا خیال کرتے ہوئے بات کی جائے، ارشاد ہے:

فقولا لهٗ قولاً لیناً (طه:۲) ترجمہ: ان سے نرمی کے ساتھ بات کرو۔

وَاغْضُضْ مِن صوتِك إنَّ انکرَ الأصواتِ لصوتُ الحمیر (لقمان:۲)

ترجمہ: پست آواز میں بات کرو اس لیے کہ سب سے بُری آواز گدھے کی ہے۔

قولٌ معروف ومغفرة خیر من صدقة یتبعها اذیً (بقرة:۳٦)

ترجمہ: اچھی بات کہنا اور درگذر کرنا، اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔

اس طرح قرآنی آداب کی بے شمار مثالیں ہیں، یہاں صرف بطورِ نمونہ چند چیزیں پیش کی گئی ہیں۔

تزکیہ

شخصیت کی تعمیر کے لیے تزکیہ کی بھی شدید ضرورت ہے، قرآنِ کریم نے ایسے شخص کی کامیابی کی ضمانت دی ہے جس نے اپنا تزکیہ کیا:

قد أفلح مَنْ زکّٰها (الشمس) ترجمہ: جس نے اپنا تزکیہ کیا وہ یقیناً کامیاب ہوگیا۔

قرآن کریم نے فرائضِ رسالت میں اس کو شمار کیا ہے۔

یتلو علیهم آیاتهٖ ویزکیهم (آل عمران: ١٦٤)

ترجمہ: رسول ﷺ ان کو خدا کی آیات سناتے ہیں اور انکا تزکیہ کرتے ہیں۔

تزکیہ کا مطلب ہے اصلاحِ قلب اور اصلاحِ باطن، جب تک انسان کا باطن درس نہیں ہوتا، ظاہری وضع داری سے کچھ نہیں ہوتا؛ بلکہ باطن کے فساد کے ساتھ دکھاوے کا تقویٰ نفاق کو جنم دیتا ہے، اور اس سے شخصیت بننے کے بجائے اور بگڑ جاتی ہے، دورِ خاپن انسانیت کے لیے بدترین لعنت ہے، قرآن اور صاحبِ قرآن نے اصلاحِ باطن پر بہت زیادہ توجہ دی ہے، اور ایمان کو دل ونگاہ میں راسخ کرنے کی تلقین کی اور اس کے لیے خوف خدا، آخرت کی جواب دہی، جہنم کا ڈر اور دنیا وآخرت کی ذلت ورسوائی کے حوالے دیے ہیں اور دکھاوے کے ہر عمل پر وعید سنائی ہے۔

❁ نماز بہت بڑی عبادت ہے لیکن غفلت وریا کے ساتھ ادا کی جائے تو ثواب کے بجائے گناہ بن جاتی ہے:

فویلٌ للمصلین الذین هم عن صلاتِهم سَاهون الذین هم یُراؤن (ماعون)

ترجمہ: ''ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے، جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں اور محض دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں'':

ان المنافقین یخٰدعون اللّٰه وهو خادِعُهم وإذا قاموا إلی الصلٰوةِ قاموا کُسالیٰ یراؤن الناسَ ولا یذکرون اللّٰه الا قلیلاً (نساء: ٢١)

ترجمہ: منافقین خدا کو دھوکہ دیتے ہیں؛ حالانکہ وہ خود دھوکہ میں مبتلا ہیں، یہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، محض لوگوں کو دکھانے کے لیے

اوراللہ کوبس برائے نام ہی یاد کرتے ہیں۔

یٰایھا الذین آمنوا لاتُبطِلوا صدقٰتکم بالمَنِّ و الأذیٰ کالذي یُنفِقُ مالَہٗ رئاءَ الناسِ ولایُومِنُ باللّٰہ والیوم الآخر (بقرۃ:۲٦٣)

ترجمہ:''اے ایمان والو! اپنے صدقات کواحسان جتا کر، یا ایذا پہنچا کر ضائع مت کرو، اس شخص کی طرح جواپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہےاور اللہ اور روزِ آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔''

❁ دورُخا پن کوقرآن نے منافقوں کی خاص عادت قرار دیا ہے:

وإذا لقوا الذین قالوا آمنا واذا خَلَوا الٰی شیٰطینھِم قالوا إنا معکم إنّما نحن مستھزؤن (بقرۃ:۲)

ترجمہ: اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور جب اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے لیے احادیث میں بھی شدید وعیدیں آئی ہیں:

ایک حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن خدا کے نزدیک سب سے بدتر دورُخے شخص کو پاؤگے جوکچھ لوگوں کے پاس جاتا ہےتو اس کا رخ اور ہوتا ہےاور دوسروں کے پاس جاتا ہےتو اور (بخاری کتاب الأدب باب ماقیل في ذي الوجھین)

ایک اورحدیث میں ہے:

''دنیا میں جس شخص کے دورخ ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں دوزبانیں ہوں گی'' (ابوداوٴد کتاب الادب باب ذي الوجھین)

ایک بارحضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ ہم لوگ امراء وحکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور وہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں، بولے ہم لوگ عہدِ رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے۔ (صحیح بخاری باب ماقیل فی ذی الوجھین)

❁ انسان کے باطنی امراض میں بدگمانی خطرناک مرض ہے، ایسے شخص کوکبھی سکون نہیں ملتا اور نہ دوسروں کوسکون سے رہنے دیتا ہے، قرآن اس کو بڑا گناہ قرار دیتا ہے اوراس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے:

یٰایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیراً مِنَ الظنِّ إنَّ بعضَ الظنِ إثم. (حجرات:۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! زیادہ بدگمانی سے بچا کرو بیشک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس طرح بدگمانی سے بچنا ضروری ہے، اسی طرح بدگمانی کے مواقع سے خود کو بچانا بھی ضروری ہے۔

ایک دفعہ حضور ﷺ اعتکاف میں تھے، رات کو ازواجِ مطہرات میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں، آپ ﷺ اُن کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری صحابی آگئے، وہ آپ کو دیکھ کر واپس پھرنے لگے، آپ نے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں ہیں، انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر مجھے بدگمانی ہی کرنی ہوتی تو آپ کے ساتھ کرتا، ارشاد ہوا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح گردش کرتا ہے (صحیح مسلم باب انه یستحب لمن روی خالیاً بامر أة یقول هذہٖ فلانة)

❁ باطنی بیماریوں میں ایک بڑی بیماری بخل ہے، قرآن نے اس کی اصلاح کی طرف توجہ دی ہے، ارشاد فرمایا:

و لا یَحسبنَّ الذین یبخلون بما آتٰهم اللّٰهُ مِنْ فضلهٖ هو خیرًا لهم بل هو شرلهم سیطوقون ما بخلوا بهٖ یومَ القیٰمة (آل عمران:۱۸)

ترجمہ: اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو دیا ہے روکے رکھتے ہیں، وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں؛ بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہیں، جس مال کو بچانے کے لیے وہ بخل کے شکار ہیں، وہ ان کے گلے میں طوق بنا کر لٹکا دیا جائے گا۔

اس مضمون کی بہت سی آیات قرآن میں موجود ہیں، طوالت کے خوف سے ترک کرتا ہوں۔

اسی طرح حرص وطمع، حسد و بے ایمانی، غیظ وغضب، بغض وکینہ، فخر وغرور، خود بینی وخود نمائی اور خودرائی وغیرہ بہت سے اندرونی امراض ہیں، جن کا تعلق انسان کے دل ودماغ سے ہے، جن کا قرآن نے خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے اور ان کی اصلاح پر زور دیا ہے، طوالت کے ڈر سے صرف آیات کے حوالے پر اکتفا کرتا ہوں (دیکھئے نسار:۹، حشر:۱، حجر:۶، نسار:۵، کہف:۱۰، بقرہ:۳۲، نسار:۱، اعراف:۲۴، حشر:۱، حجر:۴، اعراف:۲، ۴-۵، ابراہیم:۳، مومنون:۳، ہود:۳، مومن:۴، نحل:۳، بنی اسرائیل:۴، لقمان:۲، نسار:۸، بقرۃ:۱۳، وغیرہ۔

(جاری)

❁ ❁ ❁

ذوالقرنین — ایک تحقیقی جھلک

از: ڈاکٹر نوشاد عالم
سوپول بازار، بیرول، دربھنگہ

بعض حضرات کو یہ مغالطہ ہوگیا ہے کہ سکندر مقدونی ہی وہ ذوالقرنین ہے جس کا ذکر قرآن شریف کے سورۂ کہف میں کیا گیا ہے، یہ قول بہ اتفاق جمہور علماء سلف وخلف قطعاً باطل ہے، اس لیے کہ قرآن شریف کی تصریحات کے مطابق ذوالقرنین صاحبِ ایمان اور مردِ صالح بادشاہ تھا جب کہ سکندر مقدونی مشرک اور جابر بادشاہ گذرا ہے، جس کے شرک وظلم کی صحیح تاریخ خود اس کے بعض امرائے دربار نے بھی مرتب کی ہے اور تمام معاصرانہ شہادتیں بھی اس کے بت پرست اور جابر وظالم ہونے پر متفق ہیں۔

امام بخاریؒ نے کتاب ''احادیث الانبیاء'' میں ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ سے قبل نقل کیا ہے اس کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں:

وَفِيْ اِيْرَادِ الْمُصَنِّفِ تَرْجَمَةَ ذِي الْقَرْنَيْنِ قَبْلَ اِبْرَاهِيْمَ اِشَارَةٌ اِلٰى تَوْهِيْنِ قَوْلِ مَنْ زَعَمَ اِنَّهُ الْاِسْكَنْدَرُ الْيُوْنَانِيُ.

''مصنف نے ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ سے قبل اس لیے بیان کیا ہے کہ وہ اس شخص کے قول کو کمزور کرنا چاہتے ہیں جو سکندر یونانی کو ذوالقرنین کہتا ہے۔'' (فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۴)

اور پھر حافظ ابن حجرؒ نے اپنی جانب سے تین وجوہ فرق بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ سکندر یونانی کسی طرح بھی قرآن شریف میں مذکور ذوالقرنین نہیں ہوسکتا ہے، انھوں نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جن حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کہا ہے غالباً ان کو اس روایت سے مغالطہ ہوا ہے، جو طبری نے اپنی تفسیر میں اور محمد بن ربیع جیزی نے ''کتاب الصحابہ'' میں نقل کی ہے اور جس میں اس کو رومی اور بانی اسکندریہ کہا گیا ہے، مگر یہ روایت ضعیف اور ناقابل اعتماد ہے (فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۴) اور حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ ذوالقرنین کے نام کی تعیین سے متعلق مختلف اقوال نقل

کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اسحٰق بن بشیر نے بروایت سعید بن بشیر قتادہ سے نقل کیا ہے کہ ذوالقرنین کا نام سکندر تھا، اور یہ سام بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا، لیکن بعض لوگ اسکندر بن فیلپس (مقدونی) کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے ہیں، جو رومی اور بانی اسکندریہ ہے، مگر واضح رہے کہ یہ دوسرا ذوالقرنین پہلے سے بہت زمانہ بعد پیدا ہوا ہے؛ کیوں کہ سکندر مقدونی حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال قبل ہوا ہے اور مشہور فلسفی اور ارسطاطالیس اس کا وزیر تھا اور یہ ہی وہ بادشاہ ہے جس نے دارا بن دارا کو قتل کیا اور فارس کے بادشاہ کو ذلیل کر کے ان کے ملک پر قبضہ کرلیا، ہم نے یہ تنبیہ اس لیے کردی کہ بہت سے آدمی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی شخصیت ہیں اور یہ اعتقاد کر بیٹھے ہیں کہ قرآن شریف میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے، وہ یہی سکندر مقدونی ہے، جس کا وزیر ارسطاطالیس فلسفی تھا اور اس اعتقاد کی بدولت بہت بڑی غلطی اور بہت زیادہ خرابی پیدا ہوجاتی ہے؛ اس لیے کہ ذوالقرنین اوّل مسلمان اور عادل بادشاہ تھا اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے اور دوسرا (مقدونی) مشرک تھا اور اس کا وزیر فلسفی تھا اور ان دونوں کے درمیان تقریباً ہزار سال سے بھی زیادہ کا فصل ہے۔

پس کہاں یہ (مقدونی) اور کہاں (وہ عربی سامی) ان دونوں کے درمیان اس درجہ امتیازات ہیں کہ ماسوا غبی اور حقائق سے ناآشنا شخص کے دوسرا کوئی شخص ان دونوں کو ایک کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۰۶-۱۰۵)

اور امام رازیؒ نے اگرچہ سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دیا ہے بایں ہمہ ان کو بھی یہ اقرار ہے:

كَانَ ذُو الْقَرْنَيْنِ نَبِيًّا وَكَانَ الْإِسْكَنْدَرُ كَافِرًا وَكَانَ مُعَلِّمُهُ اَرَسْطَاطَالِيْسَ وَكَانَ يَأْتَمِرُ بِاَمْرِهٖ وَهُوَ مِنَ الْكُفَّارِ بِلَاشَكٍّ.

''ذوالقرنین نبی تھے اور سکندر مقدونی کافر تھا، اس کا معلم ارسطاطالیس تھا، وہ اس کے حکم کی تابعداری کرتا تھا، وہ بلاشبہ کافر تھا۔''

حافظ ابن حجرؒ نے اس مغالطہ کی وجہ یہ نقل کی ہے کہ چوں کہ قرآن شریف میں مذکورہ ذوالقرنین مقتدا ہے اور وہ وسیع حکومت کا مالک رہا ہے، اور سکندر یونانی بھی وسیع حکومت حکمراں رہا ہے، اس لیے اس کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے، اس لیے کہ وہ دو مملکت روم اور فارس کا بادشاہ ہوگیا تھا اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے محمد بن اسحٰق نے اپنی سیرت میں ذوالقرنین کا نام سکندر نقل کردیا ہے اور چونکہ اس کی سیرت بہت مشہور و مقبول ہے؛ اس لیے یہ نام بھی شہرت پا گیا اور حافظ عماد الدینؒ کا خیال یہ ہے کہ چونکہ اسحٰق بن بشر کی روایت میں قرآن میں مذکورہ ذوالقرنین کا نام بھی سکندر بتایا گیا ہے،

اس لیے غلطی اور نادانی سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے۔

غرض حافظ حدیث شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن عبدالبر، زہیر بن بکّار، ابن حجر، ابن کثیر، علامہ عینی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے محققین نے اس مغالطہ کی پوری طرح تردید کردی اور حقیقت بھی یہ ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کے جو محاسن ومناقب بیان کیے ہیں ان کے پیش نظر ایک بت پرست اور جابر وظالم شخص کو ان کا مصداق بنانا فاش غلطی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ وسعت حکومت اور زبردست سطوت وصولت کے لحاظ سے جس طرح بعض حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دے دیا ہے، اسی طرح یمن کے بعض تبابعہ کو بھی اہل عرب وسعت حکومت کی بنا پر ذوالقرنین کہتے آئے ہیں، مثلاً ابوکرب تبع نے اپنے دادا کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

قَدْ كَانَ ذُوالْقَرْنَيْنِ جَدِّی مُسْلِمًا مَلِكاً تُدَيِّنُ لَهُ الْمُلُوْكُ وَتَسْجُدُ

''میرا دادا ذوالقرنین (امراء القیس) مسلمان تھا اور ایسا پرشوکت بادشاہ تھا کہ بہت سے بادشاہ اس کے تابع فرماں اور اس کے سامنے پست تھے۔''

اور عرب کے مشہور شعراء امراء القیس، اوس بن حجر اور طرفہ بن عبدہ وغیرہ کے کلام میں بھی حمیری بادشاہوں کو ذوالقرنین کہا گیا ہے۔

اسی طرح ایرانی بادشاہوں میں سے اہل عرب کیقباد اور فریدوں کو بھی ان کی قاہرانہ فتوحات کی وجہ سے ذوالقرنین کہتے تھے۔

مگر یہ سب مسطورہ بالا وجہ کی بنیاد پر ہی ذوالقرنین کہلاتے رہے ہیں اور قرآن شریف میں مذکورہ ذوالقرنین میں سے کوئی نہیں ہے۔

چنانچہ حضرت استاذ الاساتذہ، محقق عصر، ممتاز محدث دارالعلوم دیوبند علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ نے اس حقیقت کو بخوبی واضح کردیا ہے، فرماتے ہیں:

وَالرَّاجِحُ اَنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَذْوَاءِ الْيَمَنِ وَلَا كَيْقَبَادَ بْنِ مُلُوْكِ الْعَجَمِ وَلَا هُوَ اِسْكَنْدَرُ بْنُ فَيْلَفُوْسَ بَلْ مَلِكٌ اٰخَرُ مِنَ الصَّالِحِيْنَ يَنْتَهِیْ نَسَبُهٗ اِلَى الْعَرَبِ السَّامِيِّيْنَ الْاَوَّلِيْنَ ذَكَرَهٗ صَاحِبُ النَّاسِخِ.

''اور راجح یہ ہے کہ ذوالقرنین (مذکور فی القرآن) نہ یمن کے بادشاہوں میں سے تھا اور نہ شاہان عجم میں سے کیقباد ذوالقرنین تھا اور نہ سکندر بن فیلفوس (مقدونی) ہی ذوالقرنین تھا؛ بل کہ وہ ان سب سے جدا ایک نیک بادشاہوں میں سے تھا، جن کا

نسب قدیم سامی عرب تک پہنچتا ہے، ناسخ التواریخ کے مصنفؒ نے ایسا ہی کہا ہے۔

نام کی طرح اس کے لقب ''ذوالقرنین'' کے متعلق بھی درج ذیل متعدد احتمالات ہیں:

(۱) ذوالقرنین اس لیے کہا گیا کہ وہ روم وفارس دو مملکتوں کا مالک تھا اور قرن جس کے معنی ''سینگ'' کے ہیں بطور استعارہ کے طاقت وحکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی دو حکومتوں کا والی اور مالک، یہ رائے اہل کتاب کی جانب منسوب ہے اور بعض مفسرین کا رجحان بھی اسی جانب ہے۔

(۲) وہ فتوحات کرتا ہوا اقصائے مشرق ومغرب تک پہنچا اور دونوں جہات میں بہت سے ممالک پر قابض ومسلط ہوا، یہ زہری کا قول ہے۔

(۳) وہب بن منبہؒ کی رائے یہ ہے کہ ذوالقرنین کے سر میں دونوں جانب سینگ کے مشابہ تانبے کے سے غدود ابھرے ہوئے تھے۔

(۴) حضرت حسن بصریؒ کی رائے ہے کہ اس کی زلفیں دراز تھیں اور وہ ہمیشہ اپنے بالوں کو دو حصے کرتا اور ان کی پٹیاں گوندھ کر دونوں کاندھوں پر ڈالے رکھتا تھا، ان دونوں کو ''قرن'' سے تشبیہ دے کر اس کو یہ لقب دیا گیا۔

(۵) حضرت علیؓ کی جانب منسوب ہے کہ ''ذوالقرنین'' ایک جابر بادشاہ کو یا اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی، بادشاہ یا قوم نے غضبناک ہو کر اس کے سر کے ایک جانب ایسی سخت چوٹ لگائی کہ وہ مر گیا، اس کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر پھر تبلیغ کا فرض انجام دیا، اس مرتبہ دوسری جانب چوٹ مار کر قوم نے اس کو شہید کر دیا، اس ضرب سے اس کے سر پر جو نشان پڑ گئے تھے، اس وجہ سے اس کو یہ لقب دیا گیا۔

(۶) وہ نجیب الطرفین تھا اس لیے والدین کی نجابت کو قرنین سے تشبیہ دی گئی اور ''ذوالقرنین'' لقب ہوا۔

(۷) اس نے اس قدر طویل عمر پائی کہ انسانی دنیا کے دو قرن (صدیوں) زندہ رہا۔

(۸) وہ جب جنگ کرتا تھا تو بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ہتھیار چلاتا؛ بلکہ دونوں رکابوں سے بھی ٹھوکر لگاتا تھا۔

(۹) اس نے زمین کی تاریکی اور روشنی دونوں حصوں کی سیاحت کی۔

(۱۰) ذوالقرنین ظاہر وباطن دونوں علوم کا حامل تھا۔

(فتح الباری ج ۶ وتاریخ ابن کثیر ج ۲، ودائرۃ المعارف بستانی ج ۸ ص ۴۱۱)

عربی تفسیروں کے اردو ترجمے — تعارف وتجزیہ

(۱)

از: مولانا اشتیاق احمد
مدرس دارالعلوم دیوبند

''ترجمہ'' مستقل ایک فن ہے، مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اس کی ضرورت واہمیت مسلم ہے، تراجم کی مختلف اصناف میں مذہبی تراجم سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں؛ اس لیے کہ ایک سروے کے مطابق دنیا بھر کے من جملہ تراجم کی خدمات میں نصف سے زائد خدمات مذہبی تراجم پر مشتمل ہیں۔ قرآنِ پاک کا ترجمہ سب سے پہلے لاطینی، پھر فرانسیسی اور پھر انگریزی میں ہوا، ایک سروے کے مطابق دنیا میں چھ ہزار پانچ سو (۶۵۰۰) زبانیں بولی جاتی ہیں، ان میں سے دو ہزار تین سو پچپن (۲۳۵۵) زبانوں میں انجیل کا ترجمہ ہو چکا ہے، اور مسلمان تجزیہ نگاروں کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے، اردو زبان آج سے چھ سات صدی پہلے وجود میں آئی، ترجمہ کی روایت اس میں دو سو سال بعد شروع ہوئی، اس زبان میں سب سے پہلے ''تمہیداتِ عین القضاۃ'' کا ترجمہ ''تمہیداتِ ہمدانی'' کے نام سے شاہ میراں جی خدانما نے ۱۶۰۳ء میں کیا، اردو زبان میں قرآنِ مجید کا سب سے پہلا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے فرزندِ ارجمند شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ۱۷۷۶ء میں کیا، اس وقت اردو زبان کی نثر اچھی خاصی صاف، سادہ اور رواں ہوگئی تھی، لیکن وہ ترجمہ خاصا لفظی تھا؛ اس لیے ان کے حقیقی چھوٹے بھائی حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ۱۷۹۵ء میں اس وقت کی فصیح وبلیغ رائج ومستند ٹکسالی زبان میں دوسرا ترجمہ کیا، یہ ترجمہ اتنا عمدہ ٹھہرا کہ اس سے اہل علم مترجمین نے ترجمہ نویسی کے متعدد اصول وضع کیے۔ (ان ساری باتوں کے حوالوں کے لیے ترجمہ نگاری اور ابلاغیات، ص: ۱۷۶ تا ۱۸۰ (مطبوعہ: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد) کو بھی دیکھا جاسکتا ہے) جب یہ ترجمہ بھی قدیم ہوگیا تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے مالٹا کی جیل میں ان کو سامنے رکھ کر ایک عمدہ ترجمہ کیا، اور اب اسلامی کتب خانوں میں محض اردو زبان میں قرآنِ کریم کے

ترجموں کی تعداد ساٹھ سے زائد ہوچکی ہے، اور تفسیروں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔

یہ حقیقت مسلم ہے کہ تفسیروں کا سب سے بڑا ذخیرہ عربی زبان میں ہے، یہی زبان دین اسلام کی صحیح اور مستند ترجمان ہے، اردو زبان میں مذہب اسلام کا سب سے زیادہ حصہ اسی زبان سے منتقل ہوا ہے، راقم الحروف نے اپنے اس مقالے میں تفسیروں کے محض ان ترجموں کے تعارف کو موضوع بنایا ہے، جو براہِ راست عربی سے اردو میں کیے گئے ہیں۔ ''بارہ تفسیروں'' کے کل تیئس ترجمے میرے محدود استقرار میں آئے ہیں، ان میں سے صرف ''پانچ تفسیریں'' ایسی ہیں، جن کے ترجمے مکمل ہوسکے ہیں، بقیہ تفسیروں کے ترجمے اب تک تشنۂ تکمیل ہیں۔ الحمدللہ یہ سارے ترجمے علماء ہند کے ہیں، ان میں بھی چودہ ترجمے علماء دیوبند نے کیے ہیں، بقیہ کے بارے میں تحقیق نہ ہوسکی کہ وہ کس مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، اُن ترجموں کا تعارف پیش خدمت ہے۔

تفسیر ابن عباسؓ

اصولِ تفسیر میں قرآنِ کریم کے معانی کی وضاحت کے لیے مفسرین نے چھ مآخذ ذکر فرمائے ہیں:

(۱) آیات کی تفسیر آیات ہی سے ہو۔
(۲) آیات کی تفسیر صحیح احادیث سے ہو۔
(۳) آیات کو آثارِ صحابہؓ کی روشنی میں سمجھا جائے۔
(۴) آیات کو تابعینؒ کے ارشادات سے سمجھا جائے۔
(۵) لغتِ عربِ اولین سے بھی مرادِ الٰہی کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔
(۶) آخری درجہ عقلِ سلیم اور فہمِ صحیح کا ہے۔

ان میں قرآن وحدیث کے بعد سب سے قابلِ اعتماد مآخذ صحابۂ کرامؓ کے آثار ہیں؛ اس لیے کہ ہم تک دین کے پہنچنے کا سب سے اہم واسطہ صحابۂ کرامؓ ہیں، انھوں نے ہی مشکوٰۃِ نبوت سے اولین مرحلے میں روشنی حاصل کی، اگر ان پر ہمارا اعتماد نہ رہا تو دین کا سارا دفتر بے اعتبار ہوجائیگا، نعوذ باللہ قرآن کی آیات بھی مشکوک ہوجائیں گی؛ اس لیے کہ یہ بھی انھیں کے واسطہ سے ہم تک پہنچی ہیں، یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے آثارِ صحابہؓ کو بڑی اہمیت دی ہے، ان میں بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا امتیاز مسلم ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے، فہمِ آیات میں انھیں ایک خاص

ذوق حاصل تھا، اور وہ دعائے نبوی کی برکت تھی (فتح الباری:۱/۱۷۰) آپ کو ''ترجمانُ القرآن'' کے مبارک لقب سے نوازا گیا (ابن مسعودؓ، مستدرکِ حاکم) آپؓ میں سارے صحابۂ کرامؓ کے علوم جمع تھے، ناچیز کے محدود علم میں دو ہی صحابۂ کرامؓ ایسے ہیں، جن کی تفسیری روایات اکٹھا کتابی شکل میں دستیاب ہیں، ایک تو حضرت ابن عباسؓ ہیں اور دوسرے حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباس کی تفسیر کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ اس کے اردو ترجمہ سے بھی امت مستفید ہورہی ہے، میرے علم میں ابھی تک ''تفسیر ابن مسعودؓ'' کا اردو ترجمہ نہیں ہوسکا ہے۔

تفسیر ابن عباسؓ کے مراتب

اس کے مؤلف علامہ ابوالطاہر محمد بن یعقوب بن محمد بن ابراہیم نجدالدین فیروزآبادی شیرازی، شافعی ہیں، (ولادت:۷۲۹ھ مطابق ۱۳۳۹ء وفات: ۲۰؍شوال ۸۱۷ھ مطابق ۳؍جنوری ۱۴۱۵ء) یہ جلیل القدر مفسر، محدث اور ادیب تھے، علمِ لغت میں اپنا ایک نمایاں مقام رکھتے تھے، علامہ فیروزآبادیؒ نے دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کی ہے، حرمین شریفین، ایشیائے کوچک، ترکی، قاہرہ کے علاوہ ہندوستان آنے کی تاریخ بھی ملتی ہے، ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:

(۱) **بصائر ذوالتميز في لطائف الكتاب العزيز**: یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے، چھ جلدوں پر مشتمل ہے، قاہرہ اور بیروت سے بارہا چھپ چکی ہے۔

(۲) **سِفر السعادة يا الصراط المستقيم** کے نام سے سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر ایک مختصر مگر جامع تصنیف ہے۔

(۳) **صحيح بخاری** کی ایک شرح کا ذکر بھی ان کے تراجم میں ملتا ہے، مگر وہ نایاب ہے۔

(۴) علامہ زمخشریؒ کی کشاف کے خطبہ کی ایک مستقل شرح بھی تحریر فرمائی تھی۔

(۵) **البُلغه في تاريخ أئمة اللغة**: یہ کتاب بھی اہلِ علم کے نزدیک اہم اور مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۶) **القاموس**: یہ سب سے مشہور اور مفید ترین لغت ہے، محققین علماء اس پر اعتماد کرتے ہیں، سید مرتضیٰ زبیدی (وفات ۱۷۹۱ء) نے ''تاج العروس'' کے نام سے اس کی دس جلدوں میں شرح لکھی ہے۔

(۷) **تنوير المقباس من تفسير ابن عباس رضی اللّٰه عنهما**: علامہ

فیروز آبادیؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیری روایات کو اکٹھا کر کے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، اشاعت کے بعد سے ہی اس کی مقبولیت چہار دانگِ عالم میں پھیل گئی؛ اس لیے کہ آپ کی شخصیت بالاتفاق امت میں ترجمان القرآن کی حیثیت سے مسلم ہے، آپ کی تفسیر وروایت کی بہت سی خصوصیات ہیں، مثلاً:

الف) روایات اکثر رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہیں، حضرت عمرؓ جیسے بڑے بڑے صحابہ کرامؓ آپ سے تفسیر قرآنی میں استفادہ کرتے تھے۔

ب) ان کی تفسیر سارے صحابۂ کرامؓ کی تفسیروں کا مظہرِ جمیل ہے؛ اس لیے کہ انھوں نے سارے صحابۂ کرامؓ کے علوم کو اکٹھا کرلیا تھا۔

ج) ان میں لغت، اشعار، محاورات، لہجات اور ایام وتاریخ سے استدلال؛ بلکہ ان کی دقیق اور مفید علمی بحث ہے۔

د) یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ کے حزم واحتیاط کا نمونہ بھی ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ: اگر ان سے کوئی مسئلہ پوچھتا تو سب سے پہلے آیات سے اس کا جواب دیتے؛ لیکن اگر کوئی حکم قرآنِ پاک میں واضح نہ ملتا تو حدیث وسنت کو بنیاد بناتے، اور اگر قولِ نبی سے مسئلہ صراحتاً ثابت نہ ہوتا تو شیخین کے اقوال میں جواب تلاشتے تھے؛ لیکن اگر ان میں بھی جواب کی جانب اشارہ نہ پاتے تو اپنی رائے بیان فرماتے، اور اپنی رائے کے دلائل بھی اچھی طرح واضح فرمادیتے تھے۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ ۱/۳۲۵)

ھ) علامہ ذہبیؒ کے بہ قول حضرت ابن عباسؓ نے قرآنِ پاک کے اجمال کی تفصیل میں بعض جگہ انجیل سے بھی استفادہ کیا ہے، مگر بڑے ہی حزم واحتیاط کے ساتھ۔

و) حضرت ابن عباسؓ کے دور میں بہت سے ایسے مسائل بھی سامنے آئے، جن کا واضح حکم قرآن وحدیث میں نہیں تھا، ان میں سے بہت سے اہم مسائل کو آپ نے آیات سے مستنبط کیا؛ اس طرح کے مجتہدات بھی آپؓ سے منقول ہیں۔

ز) آپؓ کی مرویات کی تعداد ایک ہزار چھ سو ساٹھ (۱۶۶۰) یا ایک ہزار سات سو دس (۱۷۱۰) ہے، یہ ساری روایتیں بخاری شریف اور مسلم شریف کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں بھی ہیں، حدیث شریف کا کوئی بھی مجموعہ ایسا نہیں جس میں آپؓ کی روایات درج نہ ہوں، کوئی مفسر آپ کے فہمِ قرآن سے بے اعتنائی نہیں کرسکتا، آپ کے اقوال کا بہت بڑا ذخیرہ

''جامع البیان في تفسیر القرآن'' میں ہے، یہ علامہ ابن جریر طبریؒ (۲۲۴ھ تا ۳۱۰ھ) کی مرتب کردہ ہے، یہ تفسیر کے ذخیرہ میں سب سے پہلی اور مفصل کتاب ہے۔

یہ قیمتی ذخیرہ آٹھویں صدی تک مختلف کتابوں میں منتشر تھا، اللہ تعالیٰ نے علامہ فیروز آبادیؒ کو توفیق بخشی اور انھوں نے ان مرویات کو ایک جگہ جمع فرما کر امت پر احسان فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی جزا عنایت فرمائیں (آمین)

تفسیر ابن عباس کی اسنادی حیثیت

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تفسیری افادات دنیا میں ہر طرف پھیلے، حرمین شریفین کے علاوہ عراق دمشق اور دیگر بلادِ اسلامیہ میں بھی آپؓ ہی کے شاگردوں نے آپ کی روایات؛ بلکہ فن تفسیر کو عروج بخشا، مشہور تلامذہ درج ذیل ہیں:

حضرت سعید بن جبیر امام مجاہد بن جبر، امام ضحاک بن علی بن ابی طلحہ، مقاتل بن سلیمان اور حضرت عکرمہ وغیرہ۔ (تلخیص از عرض مترجم، مع ترجمہ تفسیر ابن عباسؓ، ص: ۲۳)

حضرت ترجمانُ القرآنؓ کی روایات اِنھیں شاگردوں سے تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں مروی ہیں، کتبِ ستہ کے علاوہ مسند احمد، مسند ابوداؤد طیالسی، مسند شافعی، مسند حمیدی، معجم طبرانی، سنن دارمی، سنن دارقطنی اور المنتقی لابن جارود وغیرہ میں بھی کتاب التفسیر میں کثرت سے روایات ملتی ہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جو خلافِ واقعہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں، اس طرح کی موضوع اور الحاقی روایات کو صحیح اور مستند روایات سے الگ کرنا ضروری ہے؛ لیکن اتفاق سے اب تک یہ کام نہیں ہوسکا ہے، رہا یہ مجموعہ جس کو علامہ فیروز آبادیؒ نے ترتیب دیا ہے، وہ ایک ہی سند پر مشتمل ہے، جو محدثین ومفسرین کے نزدیک نہایت کمزور اور ناقابلِ اعتماد ہے؛ البتہ مقاصدِ شریعت اور درایت ومعانی کے لحاظ سے ذکر کردہ باتیں اکثر قابلِ اعتماد ہیں، ضرورت ہے کہ تحقیق کے کام کو کوئی محقق عالم انجام دے، جس کی نظر احادیث ورجال پر ہو، نیز مضامینِ قرآن اور تفسیرِ آیات سے اچھی خاصی مناسبت ہو، وباللہ التوفیق!

تفسیر ابن عباسؓ کے نسخے

اس تفسیر کے درج ذیل نسخے موجود ہیں:

(الف) ایک قلمی نسخہ مخطوطہ کی شکل میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں ہے۔

(ب) ۱۳۱۴ھ میں مصر سے ''دُرِّ منثور'' کے حاشیہ پر شائع ہوئی۔

(ج) ۱۳۱۶ھ میں علاحدہ طور پر مصر سے ہی شائع ہوئی۔

(د) ۱۲۸۵ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ''ترجمہ قرآن مجید'' کے ساتھ شائع ہوئی۔

(ھ) اس کے بعد حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ''ترجمہ قرآن مجید'' کے حاشیہ پر شائع ہوئی۔ (مستفاد: از عرض مترجم، تفسیر ابن عباسؓ، ص: ۷)

لبابُ النقول في أسباب النزول

تفسیر ابن عباسؓ کے ساتھ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (۹۱۱ھ) کی مشہور ومعروف کتاب ''لباب النقول في اسباب النزول'' بھی مطبوع ومترجم ہے، ''شانِ نزول'' کے موضوع پر یہ بڑی قابلِ اعتماد کتاب ہے، اس میں حدیث، اصولِ حدیث اور اصولِ درایت نصوص کو سامنے رکھ کر روایات کی تلخیص کی گئی ہے، شروع میں قدرے تفصیل سے مقدمہ لکھا ہے، اس میں شانِ نزول کی اہمیت روایات کے درمیان ترجیح کے اصول، ائمہ کے اقوال اور اپنے طرزِ تلخیص کو بڑے عمدہ انداز میں بیان فرمایا ہے، غرض یہ کہ علامہ سیوطیؒ نے اسبابِ نزول والی روایات کی سندوں کی اچھی طرح چھان بین کی ہے، راویوں کے سلسلے میں یہ بھی تحقیق کی ہے کہ کون سے راوی مذکورہ واقعہ کے وقت موجود تھے اور کون سے نہیں؟ اور آیا وہ اعلیٰ درجہ کے مفسر تھے یا نہیں؟ خود انھوں نے یہ بھی وضاحت فرمائی ہے کہ میں نے اختصار کے پیشِ نظر سندوں کو بیان کرنے کے بجائے، اس کتاب کا حوالہ دے دیا ہے، جس میں وہ روایت مذکور ہے؛ تاکہ قاری خود بھی تحقیق کر سکے، اسی طرح اپنے پیش رو مصنف علامہ واحدیؒ کے بیان کردہ مباحث کو بھی ''ک'' کے رمز کے ساتھ اس تصنیف میں شامل فرمالیا ہے، متعارض روایات کے درمیان دفعِ تعارض کی بھی کوشش کی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ''لبابُ النقول'' میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایات بہت زیادہ ہیں، لبابُ النقول کی جامعیت اور مذکورہ بالا خصوصیات کی وجہ سے امت نے اسے قبول کیا ہے۔

''لبابُ النقول'' کا اردو ترجمہ

تفسیر ابن عباسؓ کے ساتھ ''لبابُ النقول'' کی طباعت چوں کہ عربی زبان میں ایک ساتھ

عمل میں آئی تھی؛ اس لیے ترجمہ میں بھی اس کو الگ نہیں کیا گیا:

(الف) مولانا عابد الرحمٰن صدیقیؒ کے ترجمہ میں بھی لباب النقول کا ترجمہ ہے۔

(ب) اور حافظ محمد سعید احمد عاطف نے بھی اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

جس طرح ''تفسیر'' میں پہلے حضرت ابن عباسؓ کی مرویات نقل کی گئی ہیں؛ پھر اس آیت سے متعلق شانِ نزول کی روایت اگر موجود ہے تو اس کو ذکر کیا ہے؛ اسی طرح ترجمہ میں بھی پہلے آیات کا ترجمہ ہے، پھر حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کا، اس کے بعد علامہ سیوطیؒ کی ''لباب النقول'' کا ترجمہ ہے، لباب النقول کے ترجمہ سے پہلے ہر جگہ ''شانِ نزول'' اور آیت کا ابتدائی ٹکڑا عنوان کے طور پر لکھا گیا ہے، اور جہاں پر بات پوری ہوئی ہے، وہاں قوسین کے درمیان ''لباب النقول في اسباب النزول از علامه سيوطیؒ'' درج ہے؛ البتہ بعض جگہوں پر بین القوسین والی عبارت کتابت سے رہ گئی ہے۔

تفسیر ابن عباس کے اردو ترجمے

علامہ ابو طاہر فیروز آبادیؒ کی جمع کردہ تفسیر ابن عباسؓ کے دو ترجمے نظر نواز ہوئے:

(الف) ایک کے مترجم پروفیسر حافظ محمد سعید احمد عاطف ہیں، ان کا آبائی وطن بالاکوٹ (پاکستان) ہے۔

(ب) دوسرے کے مترجم حضرت مولانا عابد الرحمٰن صدیقی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اس ترجمہ کو پہلے ۱۹۷۰ء میں ''کلام کمپنی کراچی'' نے شائع کیا۔ اوّل الذکر مترجم نے آخر الذکر مترجم کے ترجمہ سے خصوصی استفادہ کیا ہے، جس کی صراحت خود انھوں نے ''عرضِ مترجم'' (ص:۸) میں کی ہے، دونوں مترجمین میں سے کسی کے شخصی احوال معلوم نہ ہوسکے؛ اس لیے مزید تعارف رقم نہیں کرسکتا۔

(ج) ایک اور ترجمہ کا ذکر بھی اول الذکر مترجم نے کیا ہے، یہ ۱۹۲۶ء میں آگرہ سے شائع ہوا ہے (عرضِ مترجم، ص:۸)

راقم الحروف کے خیال میں یہی اولین ترجمہ ہے، لیکن یہ ترجمہ دریافت نہ ہوسکا، اور نہ ہی اس کی مزید تفصیلات معلوم ہوسکیں۔

ترجمہ پروفیسر حافظ محمد سعید احمد عاطف

۲۰۰۶ء میں ''اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی'' نے اس ترجمہ کو شائع کیا، یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد کے صفحات کی تعداد پانچ سو پینتیس (۵۳۵) ہے، دوسری جلد چار سو چونسٹھ (۴۶۴) اور تیسری پانچ سو چار (۵۰۴) صفحات پر مشتمل ہے، صفحات کی کل تعداد پندرہ سو تین ہے، قیمت چھ سو پچھتّر (۶۷۵) روپے درج ہے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد کے توسط سے طباعت کے بعد ہی راقم الحروف کے پاس برائے تبصرہ یہ ترجمہ آیا تھا، تبصرہ لکھا گیا اور چھپا بھی، اس نسخہ میں کتابتِ قرآن کی تصحیح کی سند مع مہر تیسری جلد کے اخیر میں درج ہے، اوپر دائیں کالم میں آیات اور بائیں کالم میں مولانا فتح محمد جالندھریؒ کا ترجمہ قرآن ہے، ترجمہ کی زبان سلیس اور بامحاورہ ہے۔

تفسیر کا ترجمہ لفظی نہیں، بلکہ آزاد کیا گیا ہے، اکثر جگہوں پر لفظ دو لفظ کے اضافہ کو بھی گوارا کیا گیا ہے، تاکہ اردو خواں حلقہ کو ترجمہ پن کا احساس نہ ہو، اسی طرح ہر آیت کی تفسیر سے پہلے اس کا نمبر بھی دے دیا گیا ہے، تاکہ مقارنہ میں آسانی ہو، ''لباب النقول'' کے شانِ نزول کو بھی آیت نمبر کی تعیین کے بعد لکھا گیا ہے، اور اہم بات یہ ہے کہ دیوبند سے چھپے ہوئے ترجمہ کو سامنے رکھ کر یہ ترجمہ کیا گیا ہے، اس سے استفادہ کی صراحت خود مترجم نے کی ہے (ص:۸)

اس ترجمہ میں پہلے ''نقشِ اول'' کے نام سے ''عرضِ ناشر'' ہے، اس میں تفسیر اور اس کے جامع ومرتب کے ساتھ ترجمہ کی ضرورت بیان کی گئی ہے، ساتھ ہی مترجم ومعاونین کا شکریہ ادا کیا گیا ہے، پھر چار صفحات پر مشتمل عرضِ مترجم ہے، اس میں قرآنِ پاک، ترجمہ وتفسیر، سیرت نبویؐ اور آثارِ صحابہ وغیرہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے، ''تنویر المقباس'' کے مقام ومرتبہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کے مخطوطہ اور مطبوعہ نسخوں کی تفصیلات درج کی گئی ہیں، ساتھ ہی اس کے دو اردو ترجمے کا ذکر بھی ہے، پھر مترجم نے اپنے ترجمے کی خصوصیات بیان فرمائی ہیں، اخیر میں معاونین کا شکریہ اور قارئین سے دعا کی درخواست ہے، اس کے بعد پندرہ صفحات پر مشتمل ایک مقالہ ہے، اس میں ترجمانُ القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی زندگی کو کافی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، نام ونسب، حلیہ، شوقِ علم، دعائے نبوی کا فیضان، حیرت انگیز ذہانت، علم کے لیے اسفار، علوم اسلامی سے عمومی اور علوم قرآنی سے خصوصی دلچسپی، طرزِ تفسیر اور مرویات کی تعداد وغیرہ بھی بیان کی گئی ہے، اس کے بعد دو مضمون

ہے، ایک میں علامہ سیوطیؒ کا تعارف اور مختصر احوال ذکر کیے گئے ہیں، دوسرے میں علامہ ابوالطاہر فیروز آبادیؒ مؤلف تفسیر ابن عباسؓ کا تعارف دوصفحات میں مرقوم ہے۔

ان سب کے بعد ترجمہ کی ابتداء کی گئی ہے، سب سے پہلے علامہ سیوطی کی ''لباب النقول'' کا مقدمہ ہے، پھر ''تنویر المقباس'' کا مقدمہ ہے، آخر الذکر مقدمہ میں حمد وصلوۃ کے بعد تفسیر کے سلسلۂ سند کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد بسم اللہ کی تفسیر سے کتاب شروع ہوئی ہے، ترجمہ کی کتابت کمپیوٹر کے ذریعہ کی گئی ہے، تصحیح کے کافی جتن کے باوجود غلطیاں رہ گئی ہیں، اس ترجمہ میں سورتوں کی فہرست تو دی گئی ہے، لیکن فہرستِ مضامین نہیں ہے، اگر اس کے ساتھ فہرست مضامین بھی ہوتی تو اس کا افادہ کثیر اور آسان ہوتا؛ اس لیے کہ آج کل پوری پوری کتاب پڑھ ڈالنے کا مزاج علماء میں بھی ختم ہوتا نظر آرہا ہے تو عوام سے کس طرح اس کی امید کی جائے؟ غرض یہ کہ اردو میں ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ عوام ہی زیادہ پڑھے گی، ان کے لیے فہرست ہوتی تو اور بھی اچھا ہوتا، ان سب کے باوجود ترجمہ کا کام ٹھیک ہے، طباعت اور کاغذ وغیرہ عمدہ ہے، ٹائٹل بھی دیدہ زیب ہے۔

ترجمہ مولانا عابد الرحمٰن صدیقیؒ

تفسیر ابن عباسؓ کا دوسرا ترجمہ حضرت مولانا عابد الرحمٰن صاحب صدیقیؒ کا ہے، اس ترجمہ میں بھی علامہ سیوطیؒ کی ''لباب النقول في اسباب النزول'' شامل ہے، اس کی اشاعت دیوبند کے ''ادارہ درسِ قرآن'' نے کی ہے، ترجمہ نہایت عمدہ اور سلیس ہے، اصل متن کی مکمل تصویر ترجمہ میں جھلکتی ہے، اردو کے محاورات اور روزمروں کے استعمال سے زبان کافی معیاری بن گئی ہے، ثقیل اور مشکل الفاظ سے حددرجہ احتراز کیا ہے، اس میں آیات کے ترجمے کے لیے حضرت تھانویؒ کے ترجمہ کو منتخب کیا گیا ہے، اس سے قاری کا اعتماد اور زیادہ ہوجاتا ہے، آیات کو قدرے جلی خط میں لکھا گیا ہے، پھر اس کے نیچے لکیریں کھینچ کر اردو ترجمہ قدرے باریک خط میں دیا گیا ہے، فقہ کی روشنی میں ترجمہ چھاپنے کا یہ طریقہ مستحسن اور بہتر بھی ہے۔

اس ترجمہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ دارالعلوم دیوبند کے دو عظیم مفتیانِ کرام کی نظر سے گذرا ہوا ہے، ایک حضرت مفتی کفیل الرحمٰن صاحب نشاط عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور دوسرے حضرت الاستاذ مفتی محمد ظفیر الدین صاحب دامت برکاتہم ہیں، یہ دونوں حضرات

''دارالافتاء'' کے بڑے قابلِ اعتماد مفتی تھے، اوّل الذکر ابھی چند سال پہلے وفات پاگئے اور آخر الذکر اپنی کبرِسنی کی وجہ سے استعفا دے کر اپنے گھر میں آرام فرما ہیں۔ حضرت مفتی کفیل الرحمٰن صاحب نشاط عثمانیؒ اردو زبان وادب کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، اور بہت بڑے شاعر تھے، ان کے تین شعری مجموعے زندگی میں ہی شائع ہوکر اہلِ ذوق سے دادِ تحسین حاصل کرچکے ہیں (راقم الحروف نے اپنے ''ایم فل'' کے مقالہ میں ان شعری مجموعوں کے تجزیاتی مطالعہ کو بھی شامل کیا ہے) موصوف نے پورے ترجمہ کو بڑی گہرائی سے مطالعہ فرما کر ''عنوان بندی'' بھی کی ہے، جس سے اس ترجمہ کی افادیت میں چار چاند لگ گئے ہیں، ترجمہ کی تکمیل کے بعد اشاعت کے موقع سے چھ اشعار میں ''ہدیۂ عقیدت'' بھی پیش فرمایا ہے، اور حضرت مفتی محمد ظفیر الدین صاحب دامت برکاتہم نے اس ترجمہ پر تقریظ رقم فرمائی ہے، اور مترجم نے ''عرضِ مترجم'' کے عنوان سے سات صفحات پر مشتمل ایک دستاویزی تحریر شاملِ اشاعت فرمائی ہے، ان تمام خصوصیات کی وجہ سے یہ ترجمہ حافظ محمد سعید احمد عاطف مدظلہٗ کے ترجمہ سے بہتر معلوم ہوتا ہے، خود مترجم کو بھی اس کا اعتراف ہے، راقم الحروف کی سمجھ میں اب تک یہ بات نہ آسکی کہ اچھے ترجمہ کی موجودگی میں پھر الگ سے ترجمہ کی ضرورت ہی کیا رہ گئی تھی کہ جناب حافظ عاطف صاحب نے زحمت فرمائی؟

طریقِ اشاعت

اس ترجمہ کی اشاعت کے لیے ''ادارہ'' نے پہلے ممبر بننے کا اعلان دیا، پھر ان ممبران کو قسطوں میں ترجمہ بھیجا گیا، دیوبند سے عربی تفسیروں کے اردو تراجم میں چند ایک کی اشاعت کا یہی طریقہ لکھا ہوا دیکھا گیا، اور بعض وقت تاخیر وغیرہ کی معذرت بھی بعض قسطوں میں رقم نظر آئی۔

ترجمہ تفسیر طبری

''جامع البیان في تفسیر القرآن'' جسے تفسیر طبری کہا جاتا ہے، تفاسیر میں سب سے قدیم ہے، اس کے مؤلف علامہ محمد بن جریر رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ان کی کنیت ابوجعفر ہے، طبرستان کی طرف نسبت کی وجہ سے ''طبری'' کہلاتے ہیں، ان کی ولادت باسعادت ۲۲۴ھ اور وفات ۳۱۰ھ بتائی جاتی ہے، ''تفسیر ابن جریر'' جیسی کوئی تفسیر اسلامی کتب خانوں میں نہیں ہے، امت کے ہر طبقہ میں مقبول ومتداول ہے، شاید ہی کوئی مفسر ایسا ہو، جس نے اس تفسیر سے خوشہ چینی نہ کی ہو،

اس تفسیر کو بالاتفاق مأخذ ومرجع ہونے کی حیثیت حاصل ہے، اس کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(الف) احادیث اور روایات سے تفسیر میں بعد والی ساری تفسیروں کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(ب) آیات کی تفسیر میں اقوالِ صحابہؓ سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔

(ج) صحابہؓ، تابعینؒ اور تبعِ تابعینؒ میں سے مفسرین کی آرا بھی نقل کی گئی ہیں۔

(د) غرائب القرآن میں خصوصی طور سے لغت وزبان، محاورات واشعار سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(ھ) متعدد مسائل میں ''اجماعِ امت'' کی نشان دہی کی گئی ہے۔

(و) مفسر طبری چوں کہ خود مجتہد ہیں؛ اس لیے بہت سے مسائل میں اپنی رائے اور اپنا فیصلہ بھی انھوں نے رقم فرمایا ہے، نیز دوسرے کے اقوال پر محاکمہ بھی کیا ہے، یہ بات اور ہے کہ بعض مسائل میں اپنی رائے سے بعد کی تصانیف میں رجوع بھی کرلیا ہے۔

(ز) یہ تفسیر ان کے علاوہ دوسرے علوم وفنون اور اسرار وحکم کا گنجینہ بھی ہے۔

عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے اردو داں حلقہ کے لیے ناقابل رسائی تھی؛ اس لیے حضرت مولانا ظہور الباری اعظمی نے اس کا ترجمہ کیا، اور دیوبند کے مکتبہ ''بیت الحکمت'' کے ذریعہ اس کی اشاعت عمل میں آئی، ممبر سازی کے ذریعہ قسط وار طبع ہوکر ممبران تک وی، پی پوسٹ کے ذریعہ پہنچتی رہی، چونتیس (۳۴) پینتیس (۳۵) قسطوں میں شائع کیے جانے کا اعلان دیا گیا تھا، مگر معلوم نہیں کہ ساری قسطیں مکمل ہوئیں یا نہیں؟ تین پاروں کے چھ اجزاء مطبوع شکل میں نظر نواز ہوئے۔

ترجمہ بہت عمدہ ہے، زبان وبیان کے لحاظ سے کہیں کمی محسوس نہ ہوئی، وقت کے بہت بڑے صاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالے ہفتہ وار ''صدق جدید'' میں ترجمہ کی عمدگی کا اعتراف فرمایا ہے، اس عظیم علمی تفسیری سرمایہ کے اردو زبان میں منتقل ہونے سے ان کو بہت خوشی ہورہی تھی، تبصرہ نہایت حوصلہ افزا ہے، ۱۶/شوال ۱۳۸۴ھ کے ''صدق جدید'' کے فائل کو دیکھا جاسکتا ہے، اسی طرح مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے صدر حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ نے بھی ماہ نامہ ''برہان'' دہلی میں ''تفسیر ابن جریر طبری'' کے اردو ترجمہ کی بڑی تعریف فرمائی ہے، ان بزرگوں کے اعتماد کے بعد ترجمہ کی خوبی سے

کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا، اور سب سے بہتر تجربہ اپنا مطالعہ ہے؛ چوں کہ یہ ترجمہ اردو خواں حلقہ کو پیش کیا جا رہا ہے؛ اس لیے ان کی رعایت میں نحو وصرف کے دقیق مسائل کا ترجمہ جان بوجھ کر چھوڑ دیا گیا ہے؛ تاکہ عوام کی گرفت سے باہر نہ ہو جائے؛ البتہ قراءت اور زبان ولغت کی بحث کو تسہیل کے ساتھ ترجمہ میں پیش کیا ہے، اسی طرح شروع میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ: کتاب کے ابتدائی حصے (مقدمہ) کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے۔

راقم الحروف کو یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ قراءت اور زبان کی بحث کو جب تسہیل کے ساتھ بیان کرنے کی شکل نکالی گئی تو پھر نحو وصرف کے مسائل کو کیوں چھوڑ دیا گیا؛ کیا ان کو تسہیل بیانی کے ذریعہ ترجمہ میں شامل کرنا ممکن نہ تھا؟ یہ طے کر لینا کہ اس کو عوام ہی پڑھے گی خواص اور درمیان کے اہل ذوق استفادہ نہیں کریں گے، محلِ نظر ہے؛ اس لیے ہر جز، کا سلیقہ سے ترجمہ ہونا ضروری تھا، اسی طرح ''مقدمہ'' کو ترجمہ سے مستثنیٰ کرنا بھی مناسب نہیں تھا، اس کو بھی تسہیل کے ساتھ ترجمہ میں شامل کیا جاتا تو بہتر تھا، خیر! پسند اپنی اپنی...

اس تفسیر میں اچھی خاصی تعداد میں اسرائیلی روایات؛ بلکہ ضعیف کے ساتھ موضوع روایات بھی ہیں، ترجمہ کے ساتھ اگر ان کے درمیان صحیح اور غلط، ثابت اور غیر ثابت کی نشاندہی کر دی جاتی تو اور بھی بہتر تھا، جیسا کہ ''ابن کثیر'' میں مفسر نے خود یہ کام کر کے اپنا اعتماد حاصل کیا ہے، اللہ کرے! ''مردے از غیب نماید وکارے بہ کند''!

غرض یہ کہ ترجمہ معیاری اور سلیقہ مند ہے، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں قرآنی آیات کے ترجمہ کے لیے سب سے قابل اعتماد ترجمہ قرآن کو منتخب کیا گیا ہے اور وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ ہے۔

(جاری)

❁ ❁ ❁

جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار

از: محمد احمد ابن مولانا محمد شفیع قاسمی
رضیۃ الابرار، سلمان آباد، بھٹکل

ہندوستان کو طویل جدوجہد کے بعد آزادی کی نعمت حاصل ہوئی، جس کے لیے ہمارے اسلاف نے زبردست قربانیوں کا نذرانہ پیش کیا، جان ومال کی قربانیاں دیں، تحریکیں چلائیں تختۂ دار پر چڑھے، پھانسی کے پھندے کو جرات وحوصلہ اور کمال بہادری کے ساتھ بخوشی گلے لگایا، قید وبند کی صعوبتیں جھلیں اور حصولِ آزادی کی خاطر میدان جنگ میں نکل پڑے، آخر غیر ملکی (انگریز) ملک سے نکل جانے پر مجبور ہوئے۔

غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے طرح طرح کی چالیں چلیں، تدبیریں کیں، رشوتیں دیں، لالچ دیئے، پھوٹ ڈالوں اور حکومت کرو کا اصول بڑے پیمانے پر اختیار کیا، فرقہ وارانہ اختلافات پیدا کیے، حقائق کو توڑمروڑ کر پیش کیا، آپس میں غلط فہمیاں پھیلائیں، تاریخ کو مسخ کیا، انگریزوں نے ہندوستان کے معصوم باشندوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے اور ناحق لوگوں کو تختۂ دار پر لٹکایا، ہندوستانیوں پر ناحق گولیاں چلائیں، چلتی ریلوں پر سے اٹھا کر باہر پھینکا؛ مگر ان کے ظلم وستم کو روکنے اور طوقِ غلامی کو گردن سے نکالنے کے لیے بہادر مجاہدین آزادی نے ان کا مقابلہ کیا اور ملک کو آزاد کرکے ہی اطمینان کا سانس لیا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کا حصہ قدرتی طور پر بہت ممتاز ونمایاں رہا ہے، انھوں نے جنگ آزادی میں قائد اور رہنما کا پارٹ ادا کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے اقتدار مسلم حکمرانوں سے چھینا تھا، اقتدار سے محرومی کا دکھ اور درد مسلمانوں کو ہوا، انھیں حاکم سے محکوم بننا پڑا، اس کی تکلیف اور دکھ انھیں جھیلنا پڑا، اسی لیے محکومیت وغلامی سے آزادی کی اصل لڑائی بھی انھیں کو لڑنی پڑی۔

انگریزوں سے باقاعدہ منظم جنگ نواب سراج الدولہ کے نانا علی وردی خان نے 1754ء

میں کی اوران کوشکست دی، کلکتہ کاڈائمنڈ ہاربر Diamond Harbour اورفورٹ ولیم Fort William انگریزوں کا مرکز تھا،علی وردی خان نے فورٹ ولیم پرحملہ کرکے انگریزوں کو بھگایا، انگریزڈائمنڈ ہاربرمیں پناہ لینے پرمجبورہوئے۔اسے پہلی منظّم اور مسلح جنگ آزادی قرار دیا جاسکتاہے۔علی وردی خان کے بعدان کے نواسہ نواب سراج الدولہ حاکم ہوئے اوراس خطرہ کومحسوس کیا کہ انگریز ان کے ملک پرآہستہ آہستہ حاوی ہورہے ہیں اوران کو ملک سے نکالناضروری ہے۔اس نے حوصلہ اورہمت سے انگریزوں کوشکست دینا چاہا؛ مگرانکادربارسازشوں کااڈہ بن گیاتھا؛اس لیےانہیں شکست ہوئی اور 1757ء میں برٹش فوج نے ان کے دارالسلطنت مرشدآبادمیں انھیں شہیدکردیا۔

تاریخ کےصفحات میں پلاسی کی جنگ 1757ء اوربکسرکی جنگ 1764 کی تفصیل موجود ہے، یہ جنگ بھی ہندوستانیوں کی شکست پرختم ہوئی،اس کے بعدانگریزبنگال، بہاراوراوڑیسہ پرپوری طرح حاوی ہوگئے۔

جنگِ آزادی میں حیدرعلی اورٹیپوسلطان کاکردار

دکن فرمانرواحیدرعلی (م1782ء) اوران کےصاحبزادہ ٹیپوسلطان کےذکرکےبغیرجنگ آزادی کی تاریخ ادھوری ہوگی،جومستقل انگریزوں کے لیے چیلنج بنے رہے،حیدرعلی اورٹیپوسلطان نے انگریزوں سے چارجنگیں کیں، ٹیپوسلطان 1782ء میں حکمراں ہوئے،1783ء میں انگریزوں سےٹیپوکی پہلی جنگ ہوئی اورانگریزوں کوشکست ہوئی۔یہ جنگ 1784ءمیں ختم ہوئی، یہ میسورکی دوسری جنگ کہلاتی ہے۔انگریزاپنی شکست کاانتقام لینے کے لیے بےچین تھے؛ چنانچہ 1792ءمیں انگریزوں نے اپنی شکست کاانتقام لیتے ہوئےحملہ کیا؛ مگراپنےبعض وزراء وافسران کی بےوفائی اوراپنی ہی فوج کی غداری اوراچانک حملہ کی وجہ سےٹیپومعاہدہ کرنے پرمجبورہوئے۔ ٹیپوکوبطورتاوان تین کروڑروپئے،نصف علاقہ اوردوشہزادوں کوبطورِیرغمال انگریزوں کودیناپڑا۔

مفکراسلام حضرت مولاناابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

’’سب سے پہلاشخص جس کواس خطرہ کااحساس ہواوہ میسورکابلند ہمت اورغیور فرمانروافتح علی خان ٹیپوسلطان (۱۲۱۳ھ۱۷۹۹ء) تھا،جس نے اپنی بالغ نظری اورغیرمعمولی ذہانت سے یہ بات محسوس کرلی کہ انگریزاسی طرح ایک ایک صوبہ

اورایک ایک ریاست ہضم کرتے رہیں گے اوراگرکوئی منظّم طاقت ان کے مقابلہ پرنہ آئی تو آخر کار پورا ملک ان کالقمہ تر بن جائے گا؛ چنانچہ انھوں نے انگریزوں سے جنگ کا فیصلہ کیا اوراپنے پورے سازوسامان، وسائل اورفوجی تیاریوں کے ساتھ ان کے مقابلہ میں آگئے“۔

ٹیپو سلطان کی جدوجہد اوراولوالعزمی

ٹیپو نے ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں اورنوابوں کوانگریزوں سے جنگ پرآمادہ کرنے کی کوشش کی، اس مقصد سے انھوں نے سلطان ترکی سلیم عثمانی، دوسرے مسلمان بادشاہوں اور ہندوستان کے امراء اورنوابوں سے خط وکتابت کی اور زندگی بھرانگریزوں سے سخت معرکہ آرائی میں مشغول رہے، قریب تھا کہ انگریزوں کے سارے منصوبوں پر پانی پھرجائے اور وہ اس ملک سے بالکل بے دخل ہوجائیں؛ مگر انگریزوں نے جنوبی ہند کے امراء کو اپنے ساتھ ملالیا اور آخرکار اس مجاہد بادشاہ نے ۴/مئی ۱۷۹۹ء کوسرنگا پٹنم کے معرکہ میں شہید ہوکر سرخروئی حاصل کی، انھوں نے انگریزوں کی غلامی اوراسیری اوران کے رحم وکرم پر زندہ رہنے پرموت کو ترجیح دی، ان کا مشہور تاریخی مقولہ ہے کہ ”گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے“۔ جب جنرل HORSE کوسلطان کی شہادت کی خبر ملی تو اس نے ان کی نعش پرکھڑے ہوکر یہ الفاظ کہے کہ: آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔“ (ہندوستانی مسلمان ص ۱۳۷)

جنگ آزادی میں شاہ ولی اللہ اورانکے شاگردوں کا کردار

ٹیپو سلطان کی شہادت نیز ہزاروں افراد کے قتل کے بعد ملک میں برطانوی اثرات بڑھتے چلے گئے، انگریز سیاسی اثرات بڑھانے کے ساتھ ساتھ مشنری ورک بھی کررہے تھے، اس زمانہ میں دینی مدارس بڑی تعداد میں تباہ کیے گئے، ان کوششوں کے ساتھ ساتھ دہلی میں ایک تحریک وجود میں آئی، جس کے بانی شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م 1762ء) تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م 1824ء) نے اپنے والد کی تحریک کو بڑھایا، وہ انگریزوں کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے 1803ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا مشہور فتوی دیا، جس میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا گیا اورسید احمد شہید رائے بریلویؒ کولبریشن

موومنٹ کا قائد مقرر کیا۔ 1831ء میں سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ بالاکوٹ میں اپنے بے شمار رفقاء کے ساتھ اس ملک کے انسانوں کو آزادی دلانے کے لیے انگریزوں اور ان کے اتحادی سکھ ساتھیوں کے خلاف جہاد میں شہید ہوئے؛ لیکن یہ تحریک چلتی رہی، مولانا نصیرالدین دہلویؒ نے قیادت کی ذمہ داری سنبھالی۔ 1840ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ انکے بعد مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ (م 1852ء) اور انکے بھائی مولانا عنایت علی عظیم آبادی (م 1858ء) نے اس تحریک کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح یہ جہاد کا قافلہ برابر رواں دواں رہا؛ حتیٰ کہ سن ستاون 1857ء تک لے آیا۔ علماء کی اس تحریک کو انگریزوں نے وہابی تحریک کے نام سے مشہور کیا جو نجد کے محمد بن عبدالوہاب نامی عالم کے نظریات پر مبنی تھی؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے اکثر افراد ہندوستان ہی کے مشہور عالم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تربیت یافتہ تھے، اور یہ تحریک انھیں کے نظریات پر مبنی تھی؛ اس لیے اسے ''ولی اللّٰہی'' تحریک کا نام دیا جانا چاہئے۔

انگریزوں کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کرنے میں علماء کرام کی خدمات

1857ء میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور شاہ اسحاق محدث دہلویؒ اور انکے شاگردوں کی محنت رنگ لائی، اور 1857ء میں علماء کرام کی ایک جماعت تیار ہوئی۔ ان میں مولانا احمداللہ شاہ مدراسیؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا فضلِ حق خیرآبادیؒ، مولانا سرفرازؒ، حاجی امداللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، حافظ ضامن شہیدؒ اور مولانا منیر نانوتویؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غدر کے زمانہ میں مولانا فضل حق خیرآبادیؒ نے انگیریزوں کے خلاف فتوی مرتب کرایا جس پر علماء دہلی سے دستخط لیے گئے، اور یہی فتوی مولانا کی گرفتاری کا سبب بنا، جب مولانا پر مقدمہ چلا اور جہاد کے فتوی کی عدالت نے تصدیق چاہی، تو مولانا نے کھل کر کہا کہ فتوی میرا ہی مرتب کیا ہوا ہے۔ 1857ء کے زمانہ میں مولانا احمداللہ شاہ مدراسیؒ سپہ سالار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ہومز لکھتا ہے: ''مولوی احمداللہ شاہ شمالی ہند میں انگریزوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ 1865ء میں مولانا احمداللہ عظیم آبادیؒ، مولانا یحییٰ علیؒ، مولانا عبدالرحیم صادق پوریؒ، مولانا جعفر تھانیسریؒ کو انڈمان بھیج دیا گیا جو کالا پانی کہلاتا ہے۔ اسی زمانہ میں مولانا فضل حق خیرآبادیؒ، مفتی احمد کاکوریؒ اور مفتی مظہر کریم دریابادیؒ کو بھی انڈمان روانہ کیا گیا،

جن میں مولانا احمداللہ عظیم آبادیؒ، مولانا یحییٰ علیؒ، اورمولانا فضل حق خیرآبادیؒ وغیرہم کا وہیں انتقال ہوگیا۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوریؒ اورمولانا جعفرتھانیسریؒ اٹھارہ سال کی قید بامشقت اورجلاوطنی کے بعد 1883ء میں اپنے وطن واپس ہوئے۔ مولانا جعفرتھانیسریؒ اپنی کتاب کالا پانی میں تحریرفرماتے ہیں: ''ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، جسم پرجیل کا لباس اور کمرپرلوہے کی سلاخیں تھیں۔ انگریز ہم تین علماء کے لیے خاص لوہے کے قفس تیارکروائے اور ہمیں ان میں ڈال دیا۔ اس پنجرے میں لوہے کی چونچ دارسلاخیں بھی لگوائیں، جس کی وجہ سے ہم نہ سہارا لے سکتے تھے، نہ بیٹھ سکتے تھے۔ ہماری آنکھوں سے آنسوں اورپیروں سے خون بہہ رہے تھے۔ غدر کے ملزمان انگریزوں کی نگاہ میں اتنے بڑے مجرم سمجھے گئے کہ غدر 1857ء میں پکڑے گئے لوگوں کو یا توسرعام پھانسی دیدی گئی یا بہت سے لوگوں کواسی جزیرے انڈمان میں موت سے بدتر زندگی گذارنے کے لیے بھیجا گیا۔ مولانا جعفرتھانیسریؒ نے جزیرہ انڈمان کی زندگی پر بہت ہی مفصل آپ بیتی ''کالا پانی'' کے نام سے لکھی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں!

جنگ آزادی میں علماء دیوبند کا کردار

1857ء میں شاملی ضلع مظفرنگر کے میدان میں علماء دیوبند نے انگریزوں سے باقاعدہ جنگ کی، جس کے امیر حاجی امداللہ مہاجرمکیؒ مقررہوئے۔ اور اس کی قیادت مولانا رشیداحمد گنگوہیؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، اورمولانا منیرنانوتویؒ کررہے تھے۔ اس جنگ میں حافظ ضامنؒ شہید ہوئے، مولانا قاسم نانوتویؒ انگریزوں کی گولی لگ کرزخمی ہوئے، انگریزی حکومت کی طرف سے آپ کے نام وارنٹ رہا؛ لیکن گرفتارنہ ہوسکے، 1880ء میں وفات پائی، دیوبند میں قبرستان قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں۔ حاجی امداداللہ مہاجرمکیؒ نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ان حالات میں ملک میں رہ کراب اپنے مشن کو برقراررکھنا ممکن نہیں، مکہ مکرمہ ہجرت کرگئے۔ وہاں سے انھوں نے اپنے مریدین ومتوسلین کے ذریعہ ہندوستان میں اپنے ہدایت وفیض کا سلسلہ جاری رکھا۔ 1899ء میں وفات پائی اور جنت المعلی میں دفن ہوئے۔ مولانا رشیداحمد گنگوہیؒ کوگرفتارکیا گیا اورسہارنپور کے قیدخانہ میں رکھا گیا، پھرکچھ دن کال کوٹھری میں رکھ کرمظفرنگر کے قیدخانہ میں منتقل کیا گیا۔ چھ ماہ تک آپ کوقیدوبند کی مصیبتیں جھیلنی پڑی۔ 1905ء میں وفات پائی۔ گنگوہ کی سرزمین میں آسودہ خواب ہیں۔ 1857ء کی جنگ میں مسلمانوں کو بظاہرشکست ہوئی، مگر یہ شکست نہیں، فتح تھی۔ 1857ء کی

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے اسلام پر حملہ کیا اسلامی عقائد، اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کو ہندوستان سے ختم کرنے کا فیصلہ کیا، یہاں سے انگریزوں کا زوال شروع ہوا، حکومت برطانیہ کا لارڈ میکالے جب وایسرائے بن کر آیا تو اس نے مغربی تہذیب اور مغربی فکر، نصرانی عقائد قائم کرنے کا ایک پروگرام بنایا، اس نے کہا: ''میں ایک ایسا نظام تعلیم وضع کر جاؤں گا جو ایک ہندوستانی مسلمان کا جسم تو کالا ہوگا مگر دماغ گورا یعنی انگریز کی طرح سوچے گا''۔

ہندوستان میں اسلام کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے چند شخصیات کو پیدا کیا، ان میں سے ایک اہم شخصیت حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تھی، اس زمانہ میں اسلام کی بقاء، اسلامی عقائد، اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کے لیے حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے ایک تحریک چلائی، جس کو تحریک دیوبند کہا جاتا ہے، جگہ جگہ مدرسہ قائم کیے، اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے رفقاء (حاجی عابد حسین دیوبندیؒ، مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ، مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ اور مولانا رفیع الدینؒ وغیرہم) کی مدد سے 15 محرم 1283ھ مطابق 30 مئی 1866ء جمعرات کے دن ضلع سہارنپور میں واقع دیوبند نامی مقام پر ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی؛ تاکہ یہ مسلمانوں میں نظم پیدا کرے، جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل میں قائم رکھنے میں معین ہو، ایشیا کی اس عظیم درسگاہ کا آغاز دیوبند کی ایک مسجد (چھتہ مسجد کے صحن میں آنار کے درخت کے سایہ میں ایک استاد (ملا محمود) اور ایک طالب علم (محمود حسن) سے ہوا جو بعد میں ''ازہر ہند'' کہلائی اور جسے دارالعلوم دیوبند کے نام سے شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، بقول حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ ''دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظِ علم کا ذریعہ ہے''۔

انڈین نیشنل کانگرس کا قیام اور اس میں مسلمانوں کا حصہ

1884ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا، جس میں بعض ممتاز اہل علم واہل فکر مسلمان بھی شریک تھے، اور اس کا قیام 1885ء میں عمل میں آیا۔ اس کے بانیوں میں مسلمان بھی شامل تھے، جن کے نام بدرالدین طیب جی اور رحمت اللہ سیانی تھے، کانگرس کا چوتھا اجلاس 1887ء میں مدراس میں ہوا، جس کی صدارت بدرالدین طیب جی نے کی۔

جنگ آزادی میں دارالعلوم دیوبند کا کردار

جنگ آزادی میں اکابر دیوبند (حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد

گنگوہیؒ) اور فرزندان دارالعلوم دیوبند (شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا عزیز گل پیشاوریؒ، مولانا منصور انصاریؒ، مولانا فضل ربیؒ، مولانا محمد اکبرؒ، مولانا احمد چکوالیؒ، مولانا احمداللہ پانی پتیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ وغیرہم) کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ 1912ء میں ریشمی رومال تحریک کی ابتداء ہوئی، جس کے بانی فرزندِ اول دارالعلوم دیوبند تھے، جن کو دنیا شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے نام سے جانتی ہے، بقول مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ: ''آپ (شیخ الہند) انگریزی حکومت اور اقتدار کے سخت ترین مخالف تھے، سلطان ٹیپو کے بعد انگریزوں کا ایسا دشمن اور مخالف دیکھنے میں نہیں آیا''۔ اس تحریک میں اہم رول آپ کے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ادا کیا، افغانستان کی حکومت کو مدد کے لیے تیار کرنا اور انگریزوں کے خلاف رائے عامہ بنانا مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا مشن تھا۔ شیخ الہندؒ کے نمائندے ملک کے اندر اور ملک کے باہر سرگرم اور فعال تھے، افغانستان، پاکستان، صوبہ سرحد اور حجاز کے اندر قاصد کا کام کررہے تھے، خلافتِ عثمانیہ کے ذمہ داروں سے مثلاً انور پاشاہ وغیرہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، اور ترکی جانے کا شیخ الہند نے خود عزم مصمم کرلیا تھا، اس مقصد کے لیے پہلے وہ حجاز تشریف لے گئے اور وہاں تقریباً دو سال قیام رہا، اس اثنا میں دو حج کیے، مکہ مکرمہ پہنچ کر حجاز میں مقیم ترک گورنر غالب پاشا سے ملاقاتیں کیں، اور ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا سے بھی ملاقات کی، جو ان دنوں مدینہ آئے ہوئے تھے، انھیں ہندوستان کی صورت حال سے آگاہ کیا اور اپنے منصوبہ سے واقف کرایا، ان دونوں نے شیخ الہندؒ کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے، ان کے منصوبے کی تائید کی اور برطانوی حکومت کے خلاف اپنے اور اپنی حکومت کے تعاون کا یقین دلایا، مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے کابل سے ریشمی رومال پر جو راز دارانہ خطوط شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کو مکہ مکرمہ روانہ کیے تھے، ان کو حکومت برطانیہ کے لوگوں نے پکڑ لیا، یہی شیخ الہندؒ کی گرفتاری کا سبب بنی اور پورے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔ 1916ء میں شریف حسین کی حکومت نے ان کو مدینہ منورہ میں گرفتار کرکے انگریزی حکومت کے حوالہ کردیا۔ شریف حسین نے خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت اور غداری کی تھی، وہ برطانوی حکومت کا وفادار دوست تھا اور خلافت عثمانیہ اور مسلمانوں کی تحریک آزادی کا شدید مخالف تھا۔ 1917ء میں شیخ الہندؒ اور ساتھوں کو بحیرۂ روم میں واقع جزیرہ مالٹا جلاوطن کیا گیا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیز گل پیشاوریؒ، مولانا حکیم نصرت حسینؒ، مولانا وحید احمدؒ وغیرہم نے مدتوں اپنے استاذ شیخ الہندؒ کے

ساتھ مالٹا کے قید خانہ میں سختیاں برداشت کیں، مالٹا کے قید خانہ میں انگریزوں نے شیخ الہندؒ کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا، سخت سے سخت سزائیں دی گئیں؛ چنانچہ مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں کہ جب شیخ الہندؒ کو مالٹا جیل میں نظر بند کیا گیا تو انگریز میرے استاد کو ایک تہہ خانہ میں لے گئے اور لوہے کی گرم تپتی ہوئی سلاخیں لے کر کمر پر لگاتے رہے اور ساتھ میں یہ فرماتے رہے کہ ''اے محمود حسن! انگریز کے حق میں فتوی دے'' جب شیخ الہندؒ ہوش میں آتے تو صرف یہی فرماتے تھے کہ ''اے انگریز! میرا جسم پگھل سکتا ہے، میں بلال کا وارث ہوں، میری جلد ادھیڑ سکتی ہے؛ لیکن میں ہرگز ہرگز تمہارے حق میں فتوی نہیں دے سکتا'' شیخ الہند کی تحریک میں مولانا منصور انصاریؒ، مولانا فضل ربیؒ، مولانا فضل محمودؒ، مولانا محمد اکبرؒ کا شمار اہم ارکان میں تھا۔ مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ، مولانا محمد احمد چکوالیؒ، مولانا محمد صادق کراچویؒ، شیخ عبدالرحیم سندھی، مولانا احمد اللہ پانی پتی، ڈاکٹر احمد انصاری وغیرہ سب مخلصین بھی مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، ان کے علاوہ مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، حکیم اجمل خان وغیرہ بھی آپ کے مشیر ومعاون تھے۔

1919ء میں جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا، جس کے بنیادی ارکان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ثناء اللہ امرستریؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالمحاسن سجاد، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ جیسے دانشوران قوم تھے۔ شیخ الہندؒ کی رہائی کے بعد سب سے پہلے 29 جولائی 1920ء کو ترکِ موالات کا فتوی شائع کیا گیا۔

آپ کی وفات کے بعد آپ کے جاں نثار شاگرد مولانا حسین احمد مدنیؒ نے آپ کے اس مشن کو جاری رکھا، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کی وفات کے بعد 1940ء سے تادم آخر جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے، کئی بار برطانوی عدالتوں میں پھانسی کی سزا سے بچے، آپ انگریزوں کی حکومت سے سخت نفرت رکھتے تھے، آپ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کے منصب پر بھی فائز تھے۔ آزادی کے بعد اصلاحی کاموں میں مصروف ہوگئے، دینی خدمت وتزکیہ نفوس کے مقدس مشن میں لگے رہے، 5 ڈسمبر 1957ء میں وفات پائی، دیوبند میں قبرستان قاسمی میں آسودہ خواب ہیں۔

تحریک خلافت اور ہندو مسلم اتحاد

1919ء میں جلیاں والا باغ سانحہ جس میں کئی افراد ہلاک ہوئے ،انھیں ایام میں تحریکِ خلافت وجود میں آئی، جس کے بانی مولانا محمد علی جوہر تھے، اس تحریک سے ہندو مسلم اتحاد عمل میں آیا۔ گاندھی جی، علی برادران (مولانا محمد علی جوہر و مولانا شوکت علی) اور مسلم رہنماؤں کے ساتھ ملک گیر دورہ کیا، اس تحریک نے عوام اور مسلم علماء کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا، جن میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا آزاد سبحانی، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا سید محمد فاخر، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا احمد سعید دہلوی وغیرھم شریک تھے، الغرض ہندوستان کے اکابر علماء نے سالہا سال کے اختلافات کو نظر انداز کر کے تحریکِ خلافت میں شانہ بشانہ کام کیا۔ 1931ء میں مولانا محمد علی جوہر گول میز کانفرنس (Round Table Conference) لندن میں شرکت کے لیے گئے اور وہیں انتقال کر گئے، حکومت نے اپنے خرچ پر انکی لاش کو بیت المقدس بھیجا، اسی مقدس سرزمین میں آسودۂ خواب ہیں۔

تحریکِ ترک موالات

1920ء میں گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے غیر ملکی مال کے بائیکاٹ اور نان کوآپریشن (ترک موالات) کی تجویز پیش کی، یہ بہت کارگر ہتھیار تھا، جو اس جنگ آزادی اور قومی جدوجہد میں استعمال کیا گیا، انگریزی حکومت اس کا پورا پورا انوٹس لینے پر مجبور ہوئی اور اس کا خطرہ پیدا ہوا کہ پورا ملکی نظام مفلوج ہو جائے اور عام بغاوت پھیل جائے، آثار انگریزی حکومت کے خاتمہ کی پیشینگوئی کر رہے تھے۔ (ہندوستانی مسلمان، ص ۱۵۷)

1921ء میں موپلا بغاوت، 1922ء میں چوراچوری میں پولیس فائرنگ، 1930ء میں تحریک سول نافرمانی ونمک آندولن، 1942ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک (Quit India Movement)، 1946ء میں ممبئی میں بحری بیڑے کی بغاوت کی حمایت میں ہونے والے مظاہروں پر پولیس فائرنگ کے دوران ہزاروں مسلمان شہید ہوئے۔ انگریزوں کی قید و بند کے مصائب جھیلنے اور انکی گولیوں کا نشانہ بننے والوں کی تعداد تو شمار سے باہر ہے۔ عام مسلمانوں کے علاوہ شہید علماء کی تعداد بیس ہزار سے پچاس ہزار تک بتائی جاتی ہے؛ مگر ان اہم لیڈروں اور ان

اہم واقعات کے بغیر پوری تاریخ ادھوری اور حقیقت سے کوسوں دور ہے، جن میں مذکورہ بالا شخصیتوں کے علاوہ بہادر شاہ ظفر، بیگم محل، نواب مظفر الدولہ، امام بخش صہبائی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، مولانا حسرت موہانی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا مظہر الحق، ڈاکٹر سید محمود وغیرہم نے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کے علاوہ بھی ایک بڑی تعداد کا ذکر تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے؛ جس کی یاد دلوں میں تازہ اور تاریخ کی نئی کتابوں میں محفوظ رہنی چاہیے؛ غرض ہر طرح ہر موقع پر مسلمان جنگِ آزادی میں برابر شریک رہے ہیں، جن کو آج فراموش کیا جارہا ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

جب پڑا وقت گلستاں پہ تو خوں ہم نے دیا
جب بہار آئی تو کہتے ہیں ترا کام نہیں

❁ ❁ ❁